سفر نامۂ مصر

(مشاہدات وتاثرات)

حضرت مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری صاحب

استاذ الحدیث وعمید کلیۃ الدعوۃ والإعلام

دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ناشر

جمعیۃ المعارف الاسلامیہ

ٹیگور مارگ، ندوہ روڈ، لکھنؤ-۲۰

نام کتاب : سفرنامۂ مصر

مصنف : حضرت مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری صاحب

صفحات : ۹۶

تعداد : ۱۰۰۰

سنہ اشاعت : دسمبر ۲۰۲۱ء

ناشر : جمعیۃ المعارف الاسلامیہ، ٹیگور مارگ، شباب مارکیٹ، لکھنؤ

کمپوزنگ وطباعت : مشہود انٹر پرائزز، ندوہ روڈ، لکھنؤ

موبائل: 7007320007

قیمت : -/80

----﴿﴿ ملنے کے پتے ﴾﴾----

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ندوی بک ڈپو، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

پاریکھ بک ڈپو، (ندوہ روڈ) شباب مارکیٹ، ٹیگور مارگ، لکھنؤ

احسان بک ڈپو، نزد شباب مارکیٹ، ٹیگور مارگ، لکھنؤ

فہرست مضامین

مضامین	صفحہ
مقدمہ	۵
حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	
اس کتاب کے بارے میں ایک تاثر	۷
ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	
پیش لفظ	۹
مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری	
عرض مرتب	۱۲
جامعۃ الازہر	۱۶
بیرونی طلباء کی رہائش گاہ	۱۹
کیچر ہال	۲۰
رات کا کھانا نہیں ملتا	۲۰
ازہر میں حاضری	۲۱
دین کی تعریف	۲۴
محاضروں کا سلسلہ	۲۵
دریائے نیل	۲۸
کتب خانہ مصر	۳۰

مضامین	صفحہ
صلاح الدین ایوبیؒ کا قلعہ	۳۱
جیزہ کا سفر	۳۲
اہرامات	۳۳
ابوالہول	۳۹
قلعہ محمد علی	۴۰
قصر جوہرہ، محمد علی باشا کا ایوان خاص	۴۱
الاقصر	۴۳
المحلۃ الکبریٰ	۴۳
مسجد سیدنا الحسینؓ میں حاضری	۴۴
مسجد عمرو بن العاصؓ	۴۵
مسجد سلطان حسن	۴۷
مسجد احمد بن طولون	۴۷
مسجد علامہ عینیؒ اور علامہ قسطلانیؒ...	۴۹
مسجد الامام الشافعیؒ	۵۰
جمعہ کا خطبہ	۵۳
ماری گرگیس	۵۳

مضامین	صفحہ
شادیاں	۵۴
امام لیث بن سعد کے مزار پر	۵۶
قرافہ عقبہ بن عامرؓ	۵۶
ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ کی آرام گاہ	۵۷
باب زویلہ	۵۸
پانوراما	۶۲
جامعۃ القاہرہ میں حاضری	۶۷
شیخ محمد عبدہ	۶۵
دارلعلوم میں حاضری	
مرکز الدعوۃ طموہ میں حاضری	۶۸
سات امراء	۶۸
دکتور عبدالخالق صاحب	۶۹
کمال زوریمی سے ملاقات	۷۰
مولانا ابوالکلام آزاد سینٹر	۷۱
رمضان المبارک کا اہتمام	۷۳
اذلۃ القرآن الکریم کے دینی پروگرام	۷۳
مائدۃ الرحمٰن	۷۳
کلام من ذہب	۷۴
اذان کا اہتمام	۷۶

مضامین	صفحہ
ایک شب کوہ طور کے دامن میں	۷۷
صحرائے سیناء	۷۸
سینٹ کیتھرائین سے معاہدہ	۷۹
خانقاہ سینٹ کیتھرائین	۸۰
کوہ طور کی طرف روانگی	۸۳
وادی طوی	۸۳
کوہ طور	۸۴
کوہ طور کی چوٹی	۸۵
مسجد کی چہار دیواری	۸۵
فتح مصر	۸۸
فاتح مصر حضرت عمرو بن عاصؓ	۸۸
فاتح مصر کو مقوقس بادشاہ کا پیغام	۸۸
حضرت عبادہ بن صامتؓ کی تقریر	۸۹
حضرت عمرو بن العاصؓ اور کبوتری...	۹۱
حضرت عمرو بن العاصؓ اور مصر...	۹۱
تیسری بار فتح مصر کا واقعہ	۹۲
مصر کی طرف اسلامی لشکر...	۹۳
حضرت عمرو بن العاصؓ کے ہاتھوں..	۹۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

(حضرت مولانا سید) محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين سيدنا محمد بن عبدالله الأمين، وعلى آله وصحبه أجمعين، وعلى من تبعهم باحسان ودعا بدعوتهم الى يوم الدين وبعد!

عالم اسلام میں مصر ان ملکوں میں ہے جن کو تاریخ اسلام میں مختلف خصوصیات کے لحاظ سے امتیاز حاصل ہے، اسلامی تاریخ میں اس کا آغاز حضرت یوسف علیہ السلام کے وہاں جانے سے ہوا، وہاں کی جو اصل آبادی تھی، وہ کفر و جاہلیت کے لوگ تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام وہاں ایک غیر ملکی اور غلام کی حیثیت سے پہنچے تھے، پھر ان کو اللہ تعالیٰ نے شہرت و تقویت اور عزت دی اور وہ وہاں نیم بادشاہ کی حیثیت سے لائق عزت ہوئے اور اس طریقہ سے ان کی قوم جو بنی اسرائیل کہلاتی ہے، وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود ایک قابل ذکر تعداد میں ہوگئی اور اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اس کو کئی صدی مشکلات اور پریشانیوں سے گزرنا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا اور انہوں نے وہاں کے حاکم اور ظالم بادشاہ کو وہاں سے جانے اور ظلم سے نجات دلانے اور رعایت دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، لیکن جب ظالمانہ برتاؤ ترک نہ کرنے پر اصرار دیکھا تو اللہ کے حکم سے ان کو لے کر مصر سے نکل گئے اور وہاں کے بادشاہ فرعون نے پیچھا کیا اور اس پر اللہ کی طرف سے اس کو سمندر میں ڈبو دیا گیا۔

اس طریقہ سے بنی اسرائیل کئی صدی وہاں رہنے کے بعد اپنے دینی مرکز یعنی بیت المقدس

سے متعلق علاقوں میں منتقل ہوگئے اور یہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت جاری رہی، اس طریقہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت دونوں طرح کی سامنے آئی، کافروں کو سمجھانے اور کوشش کرنے کا عمل اور پھر ایمان لانے والوں کو ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر متوجہ کرنے کا کام۔ اسلام کے آنے کے بعد مصر فتح ہوگیا اور مسلم اکثریت کا ملک بن گیا اور صرف یہی نہیں، بلکہ وہاں کے باشندوں کی علاقائی اور نسلی خصوصیات کی بنا پر ان کو عالم اسلام میں قیادت و برتری کا ایک دور ملا جس سے پورے عالم اسلام نے فائدہ اٹھایا۔

وہاں اسلام سے پہلے کی یادگاریں جو اہرام مصر کی صورت میں ہیں اور اس کے علاوہ مسلمانوں کے شروع عہد کی مسجدیں اور تعلیم گاہیں بھی اپنا فیض پہنچاتی ہیں اور ان کا فیض جاری ہے۔ اس طرح مصر عالم اسلام کا ایک خصوصی اہمیت کا حامل ملک ہے، وہاں کی یادگاروں اور وہاں کی تاریخ کو سامنے رکھ کر آدمی وہاں کے تاریخی اور دینی نشیب و فراز کو دیکھتا اور متاثر ہوتا ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے ہمارے ادارہ کے ایک بڑے استاد مولانا محمد خالد غازیپوری (استاد حدیث و عمید کلیہ الدعوۃ والاعلام دارالعلوم ندوۃ العلماء) کو وہاں جانے کا موقع ملا اور انہوں نے اس کو مفید بنایا اور وہاں کی خصوصیات، تاریخی مقامات اور حالات کو قلم بند کیا تاکہ انہوں نے جو کچھ دیکھا اور سمجھا، اس سے دوسرے لوگ بھی مستفید ہوں جو وہاں نہیں جاسکے۔ تو اس طریقہ سے یہ ایک ایسا سفرنامہ بن گیا کہ اس میں تاریخی اہمیت اور وہاں کی ثقافتی، تہذیبی، علمی اور دینی باتوں اور کاموں کا بھی تذکرہ ہے، اس کو پڑھنے والا دہرا فائدہ حاصل کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے (آمین)

(محمد رابع حسنی ندوی)
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۹ ربیع الاول ۱۴۴۲ھ مطابق ۶ نومبر ۲۰۲۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس کتاب کے بارے میں ایک تاثر

ماہ اپریل ۱۹۷۸ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۹۸ھ میں اس خاکسار نے محبّ گرامی مولانا سیّد محمد واضح رشید حسنی صاحب ندوی رحمہ اللہ کی رفاقت میں جمہوریہ مصر کا سفر کیا تھا، یہ سفر ہمارے مربی اور استاذ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے حکم سے ہوا تھا تاکہ اس ملک کے مشہور اداروں جامع ازہر، ازہر یونیورسٹی اور دیگر بہت سے اہم اداروں، جماعتوں اور وہاں کے ادباء اور علماء سے ملنے اور ان سے تبادلۂ خیال کے ذریعہ ندوۃ العلماء کی فکر، اس کے مقاصد اور علم وعمل کے باہمی رشتے پر وہاں کے ذمہ داروں سے کھل کر بات کرنے اور ندوۃ العلماء کے اعلیٰ مقاصد کو صحیح عملی اور علمی شکل میں پیش کرنے کا موقع ملے۔ ہمارا یہ سفر دو ماہ کی مدت پر مشتمل ہے۔ اس دوران ہم نے وہاں کے بہت سے بڑے اداروں، شہروں اور علمی مراکز کے ساتھ وہاں کے ادباء وعلماء اور اہل علم ودعوت سے ملنے کے ایک زرّیں خواب کو پورا کیا، اس سفر کی پوری داستان "**البعث الإسلامي**" کے ۹۹۔۱۳۹۸ھ کے سات شماروں میں تفصیل کے ساتھ درج ہے، جو ایک مختصر اور مفید کتاب کی شکل میں ۲۰۱۹ء مطابق ۱۴۰۰ھ میں طبع ہو چکی ہے اور اس کے ذریعہ مصر کے تمام بڑے شہروں، اداروں اور مراکز کو قریب سے دیکھنے کی داستان سامنے آسکتی ہے۔

اس وقت پیش نظر ہمارے رفیق مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی عمید کلیۃ الدعوۃ والاعلام دارالعلوم ندوۃ العلماء کا یہ سفرِ مصر ۱۹۹۸ء میں ہوا تھا، اس سفر کی داستان ''سفرنامہ مصر، مشاہدات وتاثرات'' نام سے رسالہ کی شکل میں میرے سامنے ہے جو ان کو مصر کے سفر کے دوران مرتب کرنے کا موقع ملا تھا۔ انھوں نے اس رسالہ میں اپنے سفرِ مصر اور وہاں

قیام کے دوران علمی اور ادبی سرگرمیوں پر اچھے انداز میں پوری داستان سفرِ مصر تحریر کی ہے، انھوں نے تین ماہ تک وہاں قیام کر کے اپنی علمی، ادبی اور دعوتی سرگرمیوں کو تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ اس رسالہ کے شروع میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کا مقدمہ ہے جو اس رسالہ کی مقصدیت کو واضح کرنے کے لیے کافی اور مفید ہے۔ مگر اس سفر نامہ کے مؤلف جناب مولانا محمد خالد صاحب ندوی نے بر بنائے تعلق یہ چاہا کہ میں بھی اس کے بارے میں چند الفاظ لکھ کر اس کی افادیت میں شرکت کروں اور اپنی معلومات میں اضافہ کر کے مصر کے اس سفر کے بارے میں ایک اچھی رائے قائم کر سکوں۔ میرا سفر مصر پہلی بار ۱۹۷۸ء میں مولانا سید محمد واضح رشید حسنی صاحب کی رفاقت میں ہوا تھا، اس کے بعد تین بار مزید مصر کے سفر کے مواقع پیش آئے اگر چہ میں بعد میں ہوئے اسفار کی کوئی داستاں نہیں لکھ سکا تاہم میرے پہلے سفر مصر کی داستان ہر اعتبار سے کافی ہے اور اس میں بہت سی شخصی و علمی اور عملی معلومات اور تفصیلات درج کرنے کا موقع ملا تھا جو ایک مرتب اور وسیع مضمون کی شکل میں پیش کرنے کا بروقت موقع مل چکا ہے۔ اور بعد میں دار الرشد لکھنؤ کے ذمہ دار مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی کی سرپرستی میں رسالہ کی شکل میں دار الرشید لکھنؤ کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اور ناظم ندوۃ العلماء "**سماحة العلّامة مولانا سيد محمد الرابع الحسني الندوي**" کے کلمہ تقدیم سے مزین ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا محمد خالد صاحب ندوی **عميد كلية الدعوة والإعلام** دار العلوم ندوۃ العلماء کی اس کتاب کو ہر طبقہ کے لیے مفید بنائے اور معلومات میں اضافہ کا ذریعہ ثابت ہو۔ آمین

راقم الحروف

(ڈاکٹر) سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۴۳ھ

مطابق ۲۳ نومبر ۲۰۲۱ء

پیش لفظ

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم امابعد!

پیش نظر کتابچہ دارالعلوم کے استاذ مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری کے کوہ طور کی تجلیات کے مشاہدہ اور عالم اسلام کے قلب قاہرہ کے سفر کی روداد پر مشتمل ہے۔

مولانا محمد خالد ندوی آج سے بائیس سال قابل الازہر کی دعوت پر اس کے ایک دعوتی اور تربیتی پروگرام ''تدریب الائمۃ والدعاۃ'' میں شرکت کے لئے ندوۃ العلماء کی طرف سے بطور نمائندہ گئے تھے، واپسی پر ان کے مشاہدات وتاثرات تعمیر حیات میں شائع ہوئے، چونکہ یہ سفر نامہ کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا اس لئے قارئین قاہرہ سے کم البتہ کوہ طور کی تجلیات کے مشاہدہ اور شجرہ مبارکہ سے آنے والی آواز کو سننے کے زیادہ مشتاق رہتے تھے، لیکن اچانک یہ معلوم کر کے قارئین کو صدمہ ہوا کہ سفر نامہ ختم ہوگیا، حالانکہ خود مولانا محمد خالد ندوی (جو ایک شیوہ بیان مقرر اور کامیاب معلم کے ساتھ خوش فکر شاعر بھی ہیں) ''من از شوق حضوری طول دادم داستانِ را'' کے خواہش مند تھے، لیکن وہ انسان ہی کیا جس کی ہر خواہش پوری ہوجائے، اور اگر پوری بھی ہوجائے تو مطمئن بھی ہوجائے ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

مولانا محمد خالد صاحب نے شوق حضوری ہی کے جذبہ سے کوہ طور کی حکایت میں دراز نفسی سے کام لیا ہے، اس طرح اپنی دلی تمنا پوری کر رہے ہیں، خود کوہ طور کا موضوع ایسا ہے جس نے اردو شاعری میں مختلف اسلوب میں اپنی جگہ بنالی ہے، کہیں 'ارنی' کے لفظ سے تو کہیں 'لن ترانی' کی تعبیر میں، کہیں 'کوہ طور' کا لفظ تو کہیں 'کلیم طور' کی ترکیب سے، جگر مرادآبادی کے پہلے مجموعہ کلام کا نام شعلہ طور ہے، علامہ اقبال نے اپنے اردو کلام میں کلیم اللہ اور حضرت موسیٰ کے نام

تقریباً چھیالیس مقامات پر ذکر کئے ہیں۔

ایک غیر مسلم شاعر مہاراجہ چندولال کا شعر یاد آ گیا: ؎

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا　　کچھ تو اے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

ایک اور شاعر نے کوہ طور کو موضوع بنا کر کہا ہے: ؎

اللہ اللہ سوزشِ عشقِ یار کا اتنا اثر　　میں ابھی تک جل رہا ہوں طور ٹھنڈا ہو گیا

مولانا کا یہ سفر نامہ بائیس سال قبل ہوا تھا، ہم نے پہلا سفر ۱۹۷۷ء میں کیا تھا، پھر تعلیمی فراغت کے بعد چار پانچ بار مصر کے سفر ہوئے، آخری بار ۲۰۰۲ء میں ہوا تھا، اس کے بعد سے مصر میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں، مصر کی آبادی میں اضافہ ہوا، نئی نسل کے لئے تازہ معلومات درج کر رہے ہیں، شاید سفر نامہ کے بہانے طور کی تجلی سے قارئین کو سرمہ تجلی مل جائے، امید ہے کہ یہ مختصر سفر نامہ مفید ہوگا۔

رقبہ: نوے لاکھ ۹ ہزار چار سو مربع کیلو میٹر

آبادی: نو کروڑ ۴۸ لاکھ　　سرکاری زبان: عربی

جغرافیہ: مصر شمال مشرق افریقہ کے بالکل سرے پر واقع ہے، اس کے مغرب میں لیبیا، جنوب میں سوڈان، اور شمال مشرق میں اسرائیل اور فلسطین کے ممالک ہیں، جبکہ مشرقی حصہ ساحل بحیرۂ احمر اور خلیج عقبہ سے اور شمالی ساحل بحیرہ ابیض متوسط سے ملتا ہے۔

مصر کا ملک ایشیا اور افریقہ کے درمیان واقع ہے، اس کا اکثر و بیشتر حصہ افریقہ میں ہے، جبکہ کچھ ایشیا میں ہے۔

مصر میں بحیرہ احمر اور بحیرہ ابیض متوسط کو جوڑنے کے لئے نہر سوئز کھودی گئی جس کی وجہ سے یورپ و امریکہ، ایشیا اور افریقہ کے درمیان سمندری راستے کا فاصلہ انتہائی قریب ہو گیا۔

مصر کی اقتصادیات کا اکثر و بیشتر انحصار نیل کی ندی پر ہے، جس کی آب پاشی سے غلہ، روئی اور پھل پیدا ہوتے ہیں

نہر سوئز کی تعمیر ۱۸۶۹ء میں ہو گئی، اس کی لمبائی ایک سو نوے کیلو میٹر ہے، مصر کے اس

راستے سے سالانہ بیس ہزار مال بردار جہاز گذرتے ہیں، جس سے ملک کو بڑی آمدنی ہوتی ہے۔

صوبے: مصر کے چھبیس صوبے ہیں جو درج ذیل ہیں:

اسماعلیہ، اسکندریہ، اسوان، اسیوط، البحیرہ، بنی سویف، قاہرہ، دقہلیہ، دمیاط، الفیوم، غربیہ، الجیزہ، کفرالشیخ، الاقصر، مطروح، المنیا، المنوفیہ، الوادی الجدید، شمالی سینا، پورٹ سعید، قنا، بحراحمر، شرقیہ، سوہاج، جنوبی سینا، سویز۔

مولانا محمد خالد صاحب ندوی نے اس مختصر سے سفرنامے میں مصر کی تاریخ کا خلاصہ اور عطر پیش کر دیا ہے، عالم عربی کا قلب قاہرہ تھا، عالم عربی میں وہ پہلا مرکز تھا جہاں عصری تعلیم کے مراکز قائم ہوئے، شام وحجاز اور عراق سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے کچھ لوگ یہیں آیا کرتے تھے، یہاں کی صحافت اور تعلیمی مراکز نے عرب ملکوں کو غیر معمولی حد تک متاثر کیا، ازہر بھی اس اثر سے بچ نہیں سکا، اس کا دینی وقار واعتبار تھا، اور پورے عالم اسلام میں وہ منارہ نور کا کام کرتا تھا، اساتذہ کی بڑی تعداد اب بھی اس تاریخی ادارہ کو سرکاری اثرات سے آزاد کرانے کے لئے پرعزم ہے، اور اس کے لئے قربانی بھی دے رہے ہے۔

مولانا محمد خالد صاحب نے جو کچھ مشاہدہ کیا اور جو محسوس کیا۔ وہ شاعر ہیں اس لئے بڑے حساس ہیں۔ ان کے احساسات کی بڑی حد تک ترجمانی اس سفرنامے میں آگئی ہے، مولانا کی تقریریں تو بہت ہیں، تحریریں بہت نادر اور شاذ ہیں، امید کہ اس مبارک آغاز سے ان کی تحریروں میں اضافہ ہوگا، اسی طرح ہمیں یہ بھی توقع ہے کہ ان کا شعری مجموعہ بھی سامنے آئے گا، اور فیصل غازیپوری کے تخلص سے ان کی شاعری کے نمونے بھی پڑھنے کو ملیں گے۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ان کے درس حدیث سے جس مفید سلسلے کا آغاز ہوا ہے اس میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ آمین

نذرالحفیظ ندوی ازہری

عمید کلیة اللغة العربیة وآدابها

دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۵/فروری ۲۰۲۱ء

عرض مرتب

سفر انسانی زندگی کا امتیاز اور اس کا خاصہ ہے، سفر کو وسیلہ ظفر کہا جاتا ہے، قرآن پاک میں بار بار سفر کی تاکید کی گئی ہے، تاکہ عبرت کی آنکھیں وا ہوں، حقائق زندگی کو سمجھنے کے لیے اور اس کی پنہائیوں تک پہنچنے کے لیے بصیرت کی آنکھیں کھل سکیں۔

ارشاد ربانی ہے:

"فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ"

(القرآن)

(ملکوں کا سیر کرو تا کہ تم کھلی آنکھوں سے جھٹلانے والوں کا انجام دیکھ سکو)۔

سفر کے ذریعہ ملکوں کا تمدن، ثقافت اور ان کی ترجیحات و پسند و ناپسند کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں کے باشندوں کے جذبات و عزائم اور خصوصیات کا پتہ چلتا ہے، دوسروں تک معلومات کی ترسیل کا ذریعہ یہی سفر ہوا کرتا ہے۔

اس لئے سفر کی بڑی اہمیت ہے، اس کے پیش نظر سفرنامے ترتیب دیئے گئے، چوں کہ وہ معلومات کا خزانہ ہوتا ہے، لہٰذا سفرنامے بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ قدماء کے یہاں بھی اس کا رواج رہا ہے اور متاخرین کے سفرناموں نے تو ایک صنعت اختیار کر لی ہے، افادیت و نافعیت کا اس کے ذریعہ باب کھلتا ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے شرق اوسط کی ڈائری قلمبند کر کے سفرناموں کی تاریخ میں حسین اضافہ فرمایا ہے۔ اس طرح حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کا دو مہینہ امریکہ میں ایک معلوماتی سفرنامہ ہے، جس میں تاریخ، جغرافیہ،

امریکی طبیعت وافتاد، وہاں کی تنظیموں اور تحریکات پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے، مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے اس میں مزید وسعت دی ہے، اور دنیا میرے آگے اور ''جہاندیدہ'' کے ذریعہ سفرناموں کی تاریخ میں ایک وقیع اضافہ کیا ہے۔

نومبر ۱۹۹۸ء میں تدریب الائمہ کے سہ ماہی کورس میں شرکت کے لیے مخدوم ومربی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم کے ایماء پر مصر جامعۃ الازہر جانا ہوا، بیرون ممالک کا پہلا سفر تھا۔ مصری سفارت خانہ دہلی کے کاغذات کی وصولی اور سفری کاغذات کی درستگی کے بعد سفر کا آغاز ہوا، فلائٹ بمبئی سے قاہرہ کے لیے براہِ راست تھی۔ لہٰذا لکھنؤ سے بمبئی اور بمبئی سے قاہرہ کا سفر ہوا۔ تنہائی کی وجہ سے وحشت بھی تھی۔ لیکن کیرلا کے مولانا بہاؤالدین ندوی کی وجہ سے بڑی سہولت ہوگئی، وہ بھی اس تدریب میں شرکت کے لیے جارہے تھے، اور بھی بعض کیرلا کے احباب تھے جن سے میری ملاقات جامعۃ الازہر میں ہوئی۔

تین ماہ مسلسل قیام رہا، اور وہاں کے مشائخ سے استفادہ کا موقع ملا، قاہرہ کے علاوہ جن دوسرے شہروں میں جانا ہوا اور جن شخصیات سے ملاقات ہوئی، اور جن اداروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی تفصیلات قلمبند کرلی گئیں۔ جو نوٹس کے شکل میں تھیں، تین ماہ کے بعد واپسی پر نوٹس کی مدد سے یہ سفری روداد مرتب کرلی گئی، جو پندرہ روزہ تعمیر حیات کے ۱۴ رشماروں میں قسط وار شائع ہوئی، اور یہ سفرنامہ پسند کیا گیا، اس میں خاص طور پر تاریخی مساجد اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور علماء مشائخ کے مقابر کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اھرامات مصر کے تعلق سے معلومات درج ہیں، اور وہاں کی عوامی زندگی، بازار اور شادی بیاہ کی تقریبات پر بھی روشنی ڈالی گئی، اس سفرنامہ کو معلوماتی طور پر دلچسپ بنانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

آخری قسط کوہِ طور اور اس سے وابستہ اس کی تاریخ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مدین سے مصر کے سفر کے متعلق ہے۔ اور اس کے ساتھ مصر اسلامی فکر کا حصہ کب اور کیسے بنا اس کی بھی مختصر تفصیل اخیر میں درج کردی گئی ہے۔

تقریباً ۲۲ رسال کے بعد کتابی شکل میں افادہ کے پیش نظر اس سفرنامہ کو پیش کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے، از راہِ شفقت مخدوم ومربی حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ناظم ندوۃ العلماء نے اس پر مختصر مگر جامع مقدمہ بھی قلمبند فرمادیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت والا ہی کی توجہ وعنایت کا یہ سفرنامہ ثمرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو اس کا بہترین اجر وصلہ عطا فرمائے۔ آمین!

ہمارے استاذ بلکہ استاذ الاساتذہ مخدوم ومربی ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم نے از راہ شفقت اپنے وقیع تاثرات سے اس کی قدر وقیمت میں اضافہ فرمایا، ہم آپ کے سراپا سپاس اور مشکور ہیں۔

ہمارے مخلص استاذ مرحوم جناب مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی نے اس سفرنامہ کو دیکھ کر بڑی ہمت افزائی فرمائی تھی اور معلوماتی تاثرات سے نوازا تھا، جو شامل اشاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، آمین

اسی طرح اس کے نوک پلک درست کرنے اور طباعتی مرحلے سے گذارنے میں حافظ مشہود سلمہ نے بڑا تعاون کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائے۔ (آمین)

خادم

محمد خالد ندوی غازی پوری

بروز پیر

۲۰۲۰/۱۲/۲۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصر کو عالم اسلام کا ڈھرکتا ہوا دل اور پھڑکتا ہوا دماغ کہا جاتا ہے، بڑے بڑے علماء، مشائخ، محدثین، مؤرخین، فاتحین، ادبا، نقاد، شعراء اور مجاہدین اس سرزمین سے اٹھے، صاحب عزیمت وحمیت یہاں پیدا ہوئے، اسی سرزمین سے سلطان صلاح الدین ایوبی جیسا غیور وجسور مرد مجاہد سرفروش اسلام اٹھا۔ جس کی تگ وتاز نے صلیبی طاقتوں کی کمر توڑ کر رکھ دی اور ایک عرصہ کے بعد بیت المقدس کو مسیحیوں سے آزاد کرا کر اسلام کا نام روشن کیا۔

اس سرزمین سے ام المؤمنین حضرت ماریہ قبطیہ کا تعلق تھا جن کو مصر کے بادشاہ مقوقس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ لکھتے ہوئے بھیجا تھا:

''محمد بن عبداللہ کے نام مقوقس رئیس قبط کی طرف سے سلام علیک کے بعد! میں نے آپ کا خط پڑھا اور اس کا مضمون اور مطلب سمجھا، مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں، لیکن وہ شام میں ظہور کریں گے، میں نے آپ کے قاصد کی عزت کی اور دو لڑکیاں بھیجتا ہوں، جن کی قبطیوں میں بڑی عزت کی جاتی ہے۔ اور میں آپ کے لئے سواری کا خچر اور کپڑا بھیجتا ہوں''۔

حضرت ماریہ قبطیہ اور سیرین یہ دو خواتین مصر آئی تھیں۔ ان میں سے اول الذکر حرم نبوی داخل ہوئیں اور انہیں کے بطن سے حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے، جن کی وفات پالنے ہی میں ہوئی۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں سے حضرت ہاجرہ حضرت ابراھیم علیہ السلام کی زوجیت میں آئیں اور آپ کے بطن سے جلیل القدر پیغمبر حضرت اسماعیل ذبیح اللہ پیدا ہوئے۔ اسی سرزمین پر

دریائے نیل رواں ہے، جو صدیوں سے اس پورے خطۂ ارضی کے لئے سیرابی کا واحد ذریعہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ۔

''معراج کی شب میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ پر پہونچے تو آپ نے اس کی جڑ میں دو کھلے ہوئے اور دو چھپے ہوئے دریا دیکھے۔ آپ نے اس سلسلہ میں استفسار کیا تو حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا کہ یہ کھلے ہوئے دریا نیل و فرات ہیں، مسلم شریف میں مذکور ہے۔ **کل من انہار الجنۃ**، یہ سب جنت کے دریا ہیں''۔

جامعۃ الازہر

اسی سرزمین پر جامعۃ الازہر قائم ہے۔ جو صدیوں سے علم و ہدایت کی ساقی گری میں مصروف ہے۔ تاریخ کے طویل شاہراہ پر اس کا کاروان علم کبھی موقوف نہیں ہوا، حکومتیں بدلتی رہیں، سلطنتیں قائم ہوتی رہیں، انقلابات آتے رہے، عروج و زوال کے اثر سے قومیں اور خانوادے متاثر ہوتے رہے، لیکن اس شمع علم کی لو کبھی مدھم نہیں پڑی، اسکی تنویر سے ظلمتیں کافور ہوتی رہیں، اس کا آغاز ایک تاریخی مسجد سے ہوا، جس کو معزلدین اللہ کے غلام اور سالار لشکر جوہر الصقلی نے ۳۶۱ھ میں تعمیر کیا تھا، یہ قاہرہ کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ جس کی تعمیر کے ساتھ فاطمی خلیفہ معزلدین اللہ کیلئے دو محل بھی تعمیر کئے گئے تھے۔ اس مسجد کے صحن کے بازو میں طلبہ کی رہائش کے لئے رواق بھی تعمیر کئے گئے تھے۔ اس کے ساتھ قاہرہ (جو آج مصر کا دارالسلطنت ہے) کی آبادکاری اور فصیلوں کی تعمیر کا سلسلہ بھی شروع ہوا تھا، آج بھی قاہرہ کی فصیلوں کے بعض آثار موجود ہیں، ان میں باب زویلہ (جسے آج کل باب المتولی کہا جاتا ہے) معروف ہے۔ باب زویلہ وہ تاریخی مقام ہے جہاں ہلاکو خاں کے پانچ سفراء کے سروں کو قلم کر کے لٹکا دیا گیا تھا۔ اور پورے مصر میں جہاد کی روح پھونک دی گئی تھی۔ ملک مظفر سیف الدین قطز کی قیادت میں اسلامی لشکر عین جالوت کے مقام پر ایک خونریز معرکہ کے لئے روانہ ہوا، جمعہ کے دن ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۸ھ کو یہ معرکہ پیش آیا، مسلمان غالب و منصور ہوئے اور ہمیشہ کے لئے تاتاریوں کی قوت کا طلسم پاش پاش ہوگیا۔ معزلدین اللہ کے سالار لشکر جوہر القائد نے جس

وقت فسطاط کو فتح کیا اس وقت وہاں کے باشندوں نے اطاعت کی یہ شرط رکھی کہ فاطمی خلیفہ فسطاط میں قیام پذیر نہ ہو بلکہ اس سے الگ کہیں اور قیام کیا جائے، اسی شرط کے مطابق قاہرہ کی تعمیر ہوئی جو فسطاط سے خاصے فاصلہ پر تھا۔ لیکن آج کل فسطاط بھی قاہرہ کا ایک محلہ ہو کر رہ گیا۔

بہر کیف یہ قاہرہ کی قدیم ترین مسجد ہے چونکہ اس دور میں رواج یہ تھا کی مسجدوں کے ساتھ مدرسے بھی ہوتے تھے۔ مسجد کے صحن میں درس ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا ابتداءً فاطمی فکر خیال کا یہ اہم مرکز رہا، لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس نے اس کو دین حق کے لئے قبول فرمایا۔ اور پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے دھڑکتا ہوا دل بنا دیا۔ اس کی شہرت کے پیش نظر اطراف عالم سے طلباء یہاں آنے لگے۔ بڑے بڑے علماء مشائخ عالم، ادباء، شعراء، محدثین، مفسرین۔ فقہاء اور ناقدین اس کی خاک سے اٹھے۔ اور آفاق میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ ان کی علمی فکری اور ادبی کاوشوں کی سلسبیل سے تشنہ کامان ہدایت اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ اور بے دینی کے سیلاب پر بند باندھنے میں انہوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔

لیکن رفتہ رفتہ ان لوگوں کا تسلط ہوتا گیا جو مغربی افکر کے سامنے شکست خوردہ اور معذرت خواہانہ طرز فکر کے حامل تھے، اگر چہ ازہر ہی سے ہمیشہ ایسے متصلب اور راسخ العلم حضرات بھی پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اس طرز فکر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن پہلے گروہ کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی اس لئے وہ ازہر پر چھاتا گیا، یہاں تک کہ اس درسگاہ کا پختہ دینی رنگ ماند پڑ گیا، اس کا اثر سب سے پہلے یہاں کی عام فضا پر پڑا اور زندگی کے ہر شعبہ میں اتباع سنت کا وہ اہتمام جو کسی دینی درسگاہ کی سب سے قیمتی متاع ہے رفتہ رفتہ کمزور پڑتا گیا، علم و تحقیق میں بھی انحطاط آیا لیکن اس میدان میں بھی ازہر نے کسی درجہ اپنا معیار باقی رکھا۔ مگر اب یہ علم و تحقیق ایک خشک علم و تحقیق ہے جس میں جذبہ عملی کی جان اور روحانیت کی شان شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہے۔ طلباء اور اساتذہ پر معاملات اور اخلاق میں دین کی عملداری پہلے ہی کم رہ گئی تھی اس کے بعد عبادات کا اہتمام بھی کمزور پڑا، وضع قطع میں تبدیلی ہونے لگی، چہروں پر داڑھیاں گھٹتے گھٹتے بے نشان ہو گئیں، سروں پر عمامے اور جسموں پر جبے باقی رہ گئے تھے بالآخر وہ بھی رخصت ہو گئے۔

ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ مصر کے عام نوجوانوں میں بالخصوص کالجوں اور یونیورسٹیوں میں احیاءِ دین کا ایک غیر معمولی رجحان تیزی سے جڑ پکڑ رہا ہے، یہ نوجوان دین کی طرف لوٹنا اور قوم کو لوٹانا چاہتے ہیں اور اکثر ان کے سراپا میں بھی ان کے اس ذوق کا نور چمکتا ہوا محسوس ہوتا ہے، یہ نوجوان بھی ازہر کی اس فضا اور طرزِ عمل سے نالاں ہیں۔

بہرصورت! یہ ایک حسرت ناک حقیقت ہے کہ ازہر دینی معاملات میں اپنا پہلا جیسا وقار کھو چکا ہے، علم وتحقیق کے میدان میں بیشک وہاں سے مختلف موضوعات پر صفِ اوّل کی کتابیں اور مقالے اب بھی نکل رہے ہیں، اور بحمداللہ اب ایسے مقالے بھی کم نہیں ہیں جن میں ٹھیٹھ دینی فکر کار فرما ہوتی ہے اور جو مغرب کے سامنے معذرت خواہانہ اندازِ فکر پر کھل کر تنقید کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس گئی گذری حالت میں بھی وہاں بعض ایسے علماء موجود ہیں جو عملی دنیا میں طلبہ کے لیے ایک مثال بن سکتے ہیں، لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اور وہ یہاں کی عام فضا پر اثر انداز نہیں ہیں۔ (جہانِ دیدہ ص: ۱۴۸-۱۵۰)

طلباء کی کثرت کے پیش نظر الجامع الازہر کے جنوب قبلہ کی طرف جامعۃ الازہر کے لئے سلطان محمد علی پاشا نے وہ عظیم الشان ہال بنوایا جس کو دیکھ کر شاہی ایوان کا تصور ہوتا ہے، جس کو آج شیخ محمد عبدہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے قدیم احاطہ میں چند کلیات ہیں۔ کلیۃ الشریعۃ، کلیۃ اللغۃ، کلیۃ اصول الدین اور السنۃ شرقیۃ کی تعلیم بھی یہیں پر دی جاتی ہے، ازہر کی بقیہ جدید عمارتیں وسیع آراضی پر مدینۃ النصر میں واقع ہیں، جس میں مزید ۱۴ر شعبے قائم ہیں، انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج بھی مدینۃ النصر ہی میں واقع ہے۔ جامعۃ الازہر کی دفتری شعبہ اب وہیں منتقل ہو گیا ہے، شیخ الازہر کا دفتر اور اس سے ملحق دفاتر اب تک قدیم ازہر کے مقابل ایک تین منزلہ عمارت میں ہے، جسے ادارۃ الازہر کہا جاتا ہے، اب اس کی بھی لق ودق عمارت شارع سلاح سالم پر تکمیل کے مرحلہ میں ہے، جس کو مشیخۃ الازہر کہا جاتا ہے۔

ازہر کی مختلف برانچیں پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں اور بعض برانچیں بیرون ملک میں بھی ہیں چاڈ میں چار برانچیں کام کر رہی ہیں۔ ایک برانچ جزر القمر میں بھی ہے، شام اور دیگر ممالک میں

بھی ازہر کی برانچیں قائم ہیں جن کا پورا نظام ازہر کے ماتحت ہے اکثر اساتذہ مصری ہوتے ہیں، کلیہ کا امتحان جامعۃ الازہر میں آکر دینا ہوتا ہے، چنانچہ معہد الفتح کے طلباء سے ملاقات ہوئی جو شام دمشق سے کلیہ کے امتحان میں شرکت کے لئے آئے تھے۔

ازہر میں پڑھنے والوں کی تعداد دو ڈھائی لاکھ سے اوپر ہے اگر سارے ملک کی برانچوں میں پڑھنے والوں کی تعداد بھی شمار کرلی جائے تو یہ تعداد آٹھ لاکھ تک پہنچ سکتی ہے۔

بیرونی طلباء کی رہائش گاہ

مدینۃ البعوث الاسلامیہ، بیرونی طلباء کی رہائش کے لئے خاص ہے، اس کیمپس میں تقریباً ۳۲ رواق ہیں اور سب چار منزلہ ہیں، نیچے کی منزل میں انتظامیہ کے بعض دفاتر ہیں، ہر منزل میں بیس لڑکے رہتے ہیں، اس طرح ہر رواق میں ساٹھ طلباء کی گنجائش ہے۔ بیرونی طلباء کی کثرت کی وجہ سے یہ عمارتیں ناکافی ہیں اور سب پرانی بھی ہوگئیں ہیں، صفائی ستھرائی کا نظام مخدوش ہے، اس کیمپس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پہلے یہ فوجی چھاؤنی تھی کرنل جمال عبدالناصر نے یہ پوری چھاؤنی بیرونی طلباء کے لئے وقف کردیا تھا۔ اسی بنا پر اسے مدینۃ الناصر بھی کہا جاتا ہے، جمال عبدالناصر کا اسٹیچو "صالة الاجتماعات" کے روبرو خوبصورت پارک میں لگا ہوا ہے، یہی وہ مرکزی مقام ہے جہاں تدریب کے لئے دنیا بھر کے ائمہ اور خطباء کو دعوت دی جاتی ہے اور تین ماہ اسی صالۃ الاجتماعات میں محاضروں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جس میں ازہر کے نامی گرامی ماہر فن اساتذہ کی آمد ہوتی ہے، مدینۃ البعوث میں رہنے والے سارے ہی طلباء غیر ملکی ہیں جن میں اکثریت افریقی نژاد طلباء کی ہے، طلباء پر لباس کی کوئی پابندی نہیں اور نہ ہی نمازوں کے لئے کوئی خاص محاسبہ کیا جاتا ہے، بالوں کی تراش خراش بھی عجیب نظر آئی، سر کے بال بعض طلباء کے ایسے نظر آئے جیسے ہندوستان میں بعض ہندوؤں کے بال ہوتے ہیں، اس طور پر کہ سر کے اردگرد کا حصہ بالکل صاف، بس سر کے مرکزی حصہ میں بال باقی رہتا ہے۔ عربی میں اس کو قزعۃ کہتے ہیں، اور ایسے بال رکھنے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے۔ آج کل پولیس میں رنگروٹوں کے بال جیسے ہوتے ہیں۔ سوویت یونین سے آزاد شدہ بعض مسلم

ریاستوں کے طلباء بھی بکثرت ہیں ان میں ایک خاص تعداد شیعہ طلباء کی ہے، خصوصاً آذر بائیجان کے طلباء کی تعداد انہیں کی ہے، اپنے آپ کو احناف بتاتے ہیں، شیعیت کا اظہار نہیں کرتے، بعض ایسے طلباء سے میری ملاقات بھی ہوئی، جامع ازہر کی طرف سے ان آزاد شدہ ریاستوں کے لئے بڑی سہولتیں ہیں۔ آمد ورفت کے ٹکٹ کے ساتھ اسکالرشپ بھی ان کو ملتا ہے اور ابتدائیہ میں ان کا داخلہ بھی ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا کی اگر وہ نشہ کی حالت میں گیٹ پر پائے جائیں تو بحفاظت گیٹ کیپر انہیں ان کی رہائش گاہ تک پہونچادیتا ہے اور ان سے کوئی احتساب بھی نہیں ہوتا ہے، ازہر کا یہ نرم رویہ شاید ان کے اس ماضی کی وجہ سے ہے جس نے ان کو دین سے بیزار کردیا تھا، اب وہ دین کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ لہٰذا ابتداءً اغماض سے کام لیا جانا بھی اصلاحی عمل میں مفید ثابت ہوتا ہے، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ازہر میں تربیت کا ماحول میں بہت تشنہ ہے اخلاقی حالات کے روبہ زوال ہونے میں ان ہالوں کا بھی دخل ہے جو **مدینۃ البعوث** میں قائم ہیں۔

پکچر ہال

مدینۃ البعوث میں تین ایسے ہال بھی ہیں جہاں طلباء کے لئے باقاعدہ نشستوں کا انتظام ہے اور ٹی وی کے بڑے بڑے سیٹ لگے ہوئے ہیں۔ شوقین طلباء دیر رات گئے وہاں دکھائی دیتے ہیں۔ ٹی، وی، سی، آر، ریڈیو وغیرہ رکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لہٰذا اکثر خوشحال طلباء اپنے کمروں میں بھی ٹی، وی رکھے ہوئے ہیں۔ چونکہ ہر طالب علم اپنے کمرہ میں تنہا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہیں رہ سکتا اس لئے اس طرح کے سامان رکھنے کی بڑی گنجائش بھی ہوتی ہے۔

رات کا کھانا نہیں ملتا

مدینۃ البعوث کے بیرونی طلباء کو سو پاؤنڈ مصر (تقریباً ایک ہزار روپے) بطور اسکالرشپ کے دیئے جاتے ہیں۔ مزید صبح کا ناشتہ جس میں مصری فول دو انڈے اور دودھ اور روٹی (جسے عائش کہا جاتا ہے) ملتی ہے، کبھی مربیٰ اور کیک ٹائپ کی مٹھائی بھی ہوتی ہے، دوپہر

کے کھانے میں پلاؤ ہوتا ہے جس میں موٹی سوئیاں پڑی ہوتی ہے اس کے ساتھ فول کی دال اور صلاد نیز بھنا ہوا ہاف مرغ بھی ملتا ہے، کبھی اس کی جگہ بڑے کا ایک پیس ابلا ہوا گوشت ہوتا ہے، لیکن شام کے کھانے کا نظم طلباء از خود کرتے ہیں۔ میرے لئے شام کے کھانے کا مسئلہ پیچیدہ تھا، میں خود بنا نہیں سکتا تھا، اور ہوٹل قریب نہیں تھے، دور واقع ہوٹلوں تک پہونچنا ہمارے لئے مشکل تھا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے جناب مولانا قمر الحسن قاسمی صاحب کو، انہوں نے از خود یہ ذمہ داری قبول فرمائی اور باقاعدہ شام کا کھانا عزیزم محمد سعد جو ماہم ممبئی کی درگاہ کے سجادہ نشیں کے لڑکے ہیں اور آج کل وہی سجادہ نشیں ہیں۔ ان کے ذریعہ بھیجنا شروع کیا، مولانا یوپی بجنور ضلع کے نجیب آباد تحصیل سید میراں گاؤں کے رہنے والے ہیں، بڑی خوبیوں کے مالک ہیں، آج کل وہ نگینہ بجنور کے ایک قدیم اور معروف ادارہ کے استاذ حدیث اور اصلاح البنات کے مؤسس ہیں۔ جو خود ان کے گاؤں میں قائم ہے، اور اس سے خواتین کی اصلاح و تربیت کا کام بخوبی انداز میں ہو رہا ہے۔ **اللّٰھم زد فزد۔**

ازہر کی حاضری

ازہر میں ایک شعبہ دعوت وارشاد کا بھی ہے۔ جیسے ''**اللجنة العليا للدعوة الإسلامية**'' کہا جاتا ہے یہ شعبہ بھی الازہر کی زیر نگرانی قائم ہے، اس شعبہ کے تحت سال میں سال میں چار دفعہ تین تین مہینے کا ایک تدریسی کورس ہوتا ہے جس میں مختلف ملکوں کے ائمہ اور دعاۃ کی شرکت ہوتی ہے۔ ہر دورہ تقریباً چالیس افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس **لجنة** کے انتالیسویں دورہ میں فدوی کی شرکت ہوئی، پہلی دفعہ اس دورہ میں شرکت کے لئے دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظم حضرت مولانا محمد رابع صاحب ندوی دامت برکاتہم کے نام دعوت نامہ موصول ہوا۔ حضرت ناظم صاحب نے خاکسار کا انتخاب فرمایا اور مصری سفارتخانہ میں انٹرویو کے بعد منظوری کے لئے کاغذات ازہر کو بھیج دیا گیا۔ میری داڑھی اور سر کے بال لمبے تھے، بعض اساتذہ کا خیال تھا کہ ازہر کی طرف سے منظوری ملنی مشکل ہے۔ اس لئے کہ اس ہیئت کے لوگوں کو کٹر پنتھی بنیاد پرست کہا جاتا ہے اور مصر میں ایسے لوگوں پر وقتاً فوقتاً عتاب نازل ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا اس اندیشے کے ساتھ مصری

سفارتخانہ حاضر ہوا۔ جناب شیخ رفعت مجاہد سے ملنے کے بعد یہ احساس ختم ہوگیا۔ انہوں نے جس حسن سلوک کا معاملہ کیا وہ گمان سے باہر تھا انہوں نے خندہ پیشانی سے میری درخواست قبول کی اور سفر کے ضروری کاغذات کی تیاری میں پورا پورا تعاون کیا۔

اکتوبر کے اواخر میں قاہرہ کا سفر ہوا۔ قاہرہ ایئرپورٹ پر عام مسافروں کی بہ نسبت ہم لوگوں کے ساتھ خصوصی معاملہ کیا گیا۔ میرے ساتھ مولوی بہاء الدین ندوی مہتمم دارالہدیٰ کیرالہ تھے۔ ان کی وجہ سے بڑی سہولت ہوئی۔ توقع تھی کہ **"اللجنة العليا"** کا کوئی نمائندہ ائیرپورٹ پر ضرور ہوگا۔ لیکن سفارت خانہ سے اس سفر کی اطلاع نہیں پہنچ سکی تھی اس لئے کوئی نمائندہ موجود نہیں تھا بالآخر ایک موٹر وین کرایہ پر لی گئی اور اس کے ذریعہ **مدینة البعوث** پہنچے، قیام گاہ تک پہونچنے سے پہلے ہی پاسپورٹ اور ٹکٹ ہم لوگوں سے طلب کر لئے گئے اس وقت صبح کے ساڑھے آٹھ ہو رہے تھے، لیکن کسی نے ناشتہ کے لئے نہیں بلایا۔ البتہ مولوی مدثر ندوی، مولوی مسعود الرحمٰن، مولوی عرفان ندوی صاحب آگئے اور انھوں نے چائے ناشتہ کا نظم کیا۔ ہم لوگوں کا قیام مدینۃ البعوث کی اس عمارت میں ہوا جس کی تعمیر کویت کے بیت الزکوۃ کے تعاون سے ہوئی ہے۔ یہ عمارت نسبتاً دیگر عمارتوں کے بہتر تھی کھانے کا نظام وہی تھا جس کا ذکر طلباء کے ضمن میں ہو چکا ہے، البتہ رات کے کھانے میں بعض ہلکی چیزیں جیسے دہی، پنیر یا کبھی دوپہر کے کھانے کی طرح پلاؤ وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔ یہ خصوصی انتظام صرف مہمانوں کے لئے تھا۔

تدریب کا آغاز نومبر کی پہلی تاریخ سے ہونے والا تھا۔ مختلف ملکوں سے شرکاء پہونچ رہے تھے۔ برما جزر القمر کے وفود آچکے تھے لہٰذا ابتداً انہیں سے ملنے اور وہاں کے حالات معلوم کرنے میں وقت گذرا، ہندوستانی طلباء بھی ملنے کے لئے آتے رہے۔ جو طلبہ **مدینة البعوث** میں قیام پذیر تھے ان سے تو ہر روز بلکہ ہر نماز میں ملاقات ہوتی۔ البتہ جو باہر سکونت پذیر تھے وہ اکثر عشاء بعد ملنے آتے تھے۔ مولوی عبدالسمیع کاظمی ندوی، مولوی محمد عزیر ندوی، مولوی انوار اللہ ندوی، مولوی امتیاز قاسمی، مولوی عبیداللہ اسحاقی ندوی، مولوی وحید احمد ندوی، مولوی اویس قاسمی اور مولانا ڈاکٹر عبدالمجید ندوی صاحب برابر تشریف لاتے رہے۔ ڈاکٹر عبدالمجید

ندوی اوران کی اہلیہ ریڈیو میں باقاعدہ ملازم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق اردو شعبہ سے ہے اوران کی اہلیہ ہندی شعبہ سے منسلک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ازراہ عنایت میرا ایک پروگرام بھی نشر کیا۔ اور میرے ساتھ بڑی ہمدردی اور اپنائیت سے پیش آتے رہے، ایک دن میں ایسے مرض میں مبتلا ہوگیا تھا جس میں کھالیں ادھڑ رہی تھیں، دونوں پیر متاثر تھے۔ موصوف ازراہ محبت وشفقت ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور ڈاکٹر کی فیس اور دواؤں کا نظم فرمایا۔ **فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔**

یکم نومبر ۱۹۹۷ء بروز سنیچر بوقت ساڑھے آٹھ بجے ادارۃ الازہر ہم لوگوں کو لے جایا گیا، شیخ الازہر سید علی طنطاوی وہیں پر تدریب کا افتتاح فرمانے والے تھے، ایک چھوٹے سے ہال میں ہم لوگ جمع ہوگئے، راؤنڈ ٹیبل کرسیاں لگی ہوتی تھیں ہر نمائندہ کے سامنے مائک کا بھی نظم تھا۔ ہال ایئر کنڈیشن تھا، تھوڑی دیر کے بعد شیخ الازہر تشریف لائے، تدریب الائمہ کے ذمہ دار وناظم شیخ رفعت مجاہد متولی مرحوم نے بڑھ کر استقبال کرتے ہوئے شیخ الازہر کے ہاتھوں کو بوسہ دیا وہ سیدھے آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کرسیاں ہال میں سبھی یکساں طور پر تھیں کوئی کرسی ممتاز نہیں تھی، یہاں تک کی شروع میں بعض جزرالقمر کے ائمہ یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ مخصوص کرسیاں نہیں ہیں انہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے جن پر بعد میں شیخ الازہر اور شیخ متولی تشریف فرما ہوئے۔

شیخ الازہر مصری شیوخ کے لباس میں ملبوس تھے۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی، سر پر ترکی ٹوپی جس پر سفید رومال کی پٹی لگی ہوئی تھی۔ چہرے پر وجاہت، سنجیدگی اور متانت کے ساتھ باوقار معلوم ہورہے تھے، انتہائی منکسر المزاج ہیں۔ گفتگو کا انداز عمدہ اور شگفتہ تھا۔ فصیح گفتگو فرما رہے تھے۔ رحلۂ علمیہ، علمی سفر کے موضوع پر افتتاحی تقریر فرمائی جس میں علم کی فضیلت کے ساتھ علماء کا مقام ان کا مشن اوران کی ذمہ داریوں کا تذکرہ تھا۔ گفتگو سے پہلے تمام شرکاء کو خوش آمدید کہا اور ازہر میں حاضری پر انہیں مبارکباد دی، تقریباً آدھے گھنٹے تک یہ نشست چلتی رہی بعض احباب کے استفسار کے جواب کے بعد شیخ الازہر تشریف لے گئے۔

اس کے بعد وکیل الازہر الدکتور رزق قزوق کی مختصر تعارفی گفتگو ہوئی جس میں انہوں نے ازہر

کا تعارف کرایا، اور اس کے مختلف شعبوں کا تذکرہ کیا، بعد ازاں شیخ متولی کا محاضرہ شروع ہوا شیخ کا محاضرہ تفسیر آیات الاحکام پر تھا۔ شروع میں انہوں نے انبیاء علیہم السلام اور ان کے معجزات کا تذکرہ کیا اور یہ فرمایا کہ نبیوں کے سارے معجزات وقتی تھے زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی ختم ہو گئے، اب نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوئی معجزہ موجود ہے اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا، اس لئے کہ ان کی شریعت وقتی تھی، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابدی شریعت لیکر آئے تو آپ کو یہاں بہت سے معجزات عطا کئے گئے۔ ان میں اہم اور ابدی معجزہ کے طور پر قرآن پاک عطا کیا گیا۔ اس لئے کہ آپ کے عہد میں فصحاء و بلغاء شعراء کا زور تھا، انہیں کا سکہ چلتا تھا۔ لہٰذا آپ نے کلام الٰہی کے ذریعہ انہیں چیلنج کیا اور کوئی ایک آیت قرآن پاک کی طرح لانے اور پیش کرنے پر زور دیا گیا، عرب اہل زبان ہونے کے باوجود کلام الٰہی کے مثل لانے سے قاصر رہے شیخ متولی کی گفتگو میں بعض عامی الفاظ آجانے کی وجہ سے کبھی کبھی سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی، اور ان کی گفتگو نسبتاً تیز بھی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ابھی طبیعت مانوس بھی نہیں ہوئی تھی، اس قسم کے محاضروں میں شرکت کا پہلا اتفاق تھا۔

شیخ متولی کے محاضرہ کے اختتام پر ہمیں مدینۃ البعوث واپس لانے کے لئے ازہر کی شاندار بس جس سے ہم لوگ گئے تھے آکر ازہر کے سامنے لگی ہوئی تھی ازہر کے سامنے زیریں پل سے ہم لوگوں نے سڑک عبور کیا اور بس میں سوار ہو گئے اور **مدینة البعوث** کے کانفرس ہال (**صالة المحاضرة**) میں پہونچا دئے گئے، یہاں دوسرا محاضرہ دکتور محمد الفضیل القوصہ کا "**مقارنة الاديان**" کے موضوع پر ہوا، جس میں انہوں نے دین صحیح اور غیر دین صحیح کے فرق کو بیان کیا اور یہ بتایا کہ جب ہم "الادیان" کہتے ہیں تو اس سے غیر دین صحیح مراد ہوتا ہے اس لئے کہ صحیح دین تو ایک ہی ہے جس میں مبداء اور معاد کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔

دین کی تعریف

شیخ قوصی نے فرمایا کی دین کے معنی اصلاً خضوع کے ہیں، لیکن وہ خضوع جو اختیاری اور شعوری ہو، دین کا اطلاق ہر اس مذہب پر صحیح ہے جس کو اختیاری اور شعوری طور پر قبول کیا

گیا ہو، لیکن دین صحیح کی تعریف اس سے فائق ہے، اس لئے کہ وہ خالق کون ومکاں کا برپا کردہ ہے وہ کسی کے اختیار کر لینے سے دین نہیں بنتا ہے، اسی کی تعریف علماء یوں کرتے ہیں:

"وضع الهی سائق لذوی العقول باختیارهم لا صلاح الحال وإلی سعادة المآل" (اہل دانش ذوی العقول کے لئے اللہ کی طرف سے برپا کیا گیا ہے تا کہ اپنے اختیار سے اصلاح حال اور مقام سعادت حاصل کر سکیں)۔

محاضروں کا سلسلہ

ہر روز چار محاضرہ ہوتے تھے، ہفتہ میں ایک محاضرہ ایک موضوع پر ہوتا تھا، بعض محاضرے بڑے جامع اور مفید ہوتے تھے، خصوصا **"مقارنة الادیان"**، **"الاستشراق"** اور **"الحضارة الاسلامیة"** کے موضوع پر بھی محاضرے ہوئے جو کافی حد تک مفید تھے، بقیہ محاضروں میں سورہ فاتحہ پر تفسیر بیضاوی کے انداز کا درس معلوم ہوتا تھا شیخ ازہر نے بھی قرآن پاک ہی پر گفتگو کی اس طرح کئی محاضروں میں تکرار ہی محسوس ہوئی لیکن پھر بھی فائدے سے خالی نہیں، مفتی جمہوریہ دکتور نصر فرید واصل کا محاضرہ اچھا تھا، محاضرہ کے دوران زیادہ تر ان کی گفتگو گرفت میں نہیں آتی تھی بلکہ تمام شرکاء کا یہی حال تھا لیکن ٹیپ رکاڈر کی مدد سے جب دوبارہ ان کا محاضرہ سنا تو بات سمجھ میں آئی، اور محاضرہ اچھا لگا کوشش یہ رہتی تھی کہ محاضروں کو ٹیپ کی مدد سے محفوظ رکھا جائے، لیکن سارے محاضروں کی ٹیپ کرنا بہت مشکل تھا البتہ اہم محاضروں کو ٹیپ کی مدد سے محفوظ کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔

۸/نومبر سنیچر کی شام اور بعد نماز مغرب معلوم ہوا کہ عباسیہ میں واقع مسجد النور میں مغرب کی نماز ادا کرنی ہے اور نماز مغرب وہیں زیریں ہال میں ڈاکٹر محمد عمارہ (جو مصر کے اہم اسلامی مفکرین میں سے ہیں) کا شیخ محمد عبدہ پر محاضرہ ہے وزیر اوقاف کی طرف سے دعوت نامہ بھی ملا تھا۔

لہٰذا تقریباً سارے رفقاء جو اس دورے میں شریک تھے، اس پروگرام میں شرکت کی غرض سے آئی ہوئی سٹی بس کے ذریعہ مسجد النور مغرب کے وقت پہنچ گئے، مسجد النور بہت وسیع وکشادہ اور خوبصورت مسجدوں میں سے ہے ابھی چند سال پہلے وزارت اوقاف نے اس مسجد کو از سر نو تعمیر کرایا

ہے، اس سے پہلے یہ اخوانیوں کی مسجد تھی، اخوانیوں کے پروگرام عام طور پر اس میں ہوتے تھے لیکن حکومت نے ان کی مرکزیت کو ختم کرنے کے لئے اس مسجد کو اپنی تحویل میں لے لیا اس کے خطیب مشہور عالم اور مصنف شیخ محمد غزالی مرحوم تھے، ان کی وجہ سے اس مسجد میں جمعہ کی بڑی جماعت ہوتی تھی، لیکن آخر میں وہ بھی اس منصب سے معزول کر دیئے گئے تھے، یہی حال ان تمام بڑے خطباء کا ہوا جن کی طرف عوام کا میلان حکومت نے غیر معمولی تصور کیا، فضیلۃ الشیخ عبدالصبور شاہین جو جامع عمرو بن العاصؓ کے خطیب تھے وہ بھی اسی طرح ہٹا دیئے گئے اور اب ان کی جگہ دوسرے غیر معروف خطیب کا انتخاب حکومت کی طرف سے ہوا ہے۔

مسجد نور کا محل وقوع بہت شاندار ہے، دونوں طرف وسیع سڑکیں ہیں، بازو میں ریلوے اسٹیشن بھی ہے سامنے قبلہ کی طرف برج بنا ہوا ہے، شمال میں کشادہ پارک ہے، نمازیوں کی تعداد بھی اس میں زیادہ ہوتی ہے، امام صاحب نے مغرب کی نماز خاص مصری قرأت میں پڑھائی، عام طور پر اذان اور اقامت کے درمیان مغرب کی نماز میں بھی پانچ منٹ کا وقفہ ہوتا تھا، لوگ دو رکعت سنت پڑھتے ہیں اس کے بعد امام نماز شروع کرتا ہے، یہاں اذان دیتے وقت دونوں کانوں میں انگلی لگانے کا رواج نہیں ہے اور نماز بعد دعاء بھی اجتماعی نہیں ہوتی ہے، سنتوں کا رواج بھی کم ہے، بہت کم لوگ نماز کے بعد سنتیں پڑھتے ہیں۔ البتہ فرض کی پابندی عام طور پر کی جاتی ہے، نماز پڑھتے وقت ٹوپیوں کا رواج نہیں، بہت کم لوگوں کے سروں پر ٹوپی ہوتی ہے، عام طور پر باہر کے طلباء بھی اس کے عادی ہو گئے ہیں، ہمارے ہندوستانی طلباء نے بھی ٹوپی پہننا ترک کر دیا ہے، یہاں تک کہ جو طلباء اس سال آئے ہیں ان کی بھی عادت بدل گئی ہے، البتہ امام سر پر سرخ ٹوپی اور اس پر سفید پٹی باندھے ہوئے ہوتا ہے۔

مغرب کی نماز کے بعد مسجد النور کے لیکچر ہال میں ہمیں لے جایا گیا، کرسیاں ابھی خالی تھیں، سامنے کے حصہ میں عام طور پر ائمہ اور خطباء خاص لباس (عباء اور سرخ ترکی سفید پٹی کے ساتھ) میں ملبوث تشریف فرما تھے، تھوڑی دیر میں پورا ہال بھر گیا، داہنی طرف خواتین بھی بیٹھی ہوئی تھیں اس میں بعض بے حجاب بھی تھیں اوپر کا حصہ بھی بھر چکا تھا۔ محاضر ڈاکٹر محمد عمارہ دیر سے

آئے، محاضرہ شروع ہونے سے قبل مسجد کے امام صاحب نے قرآن پاک کی چند آیتیں تلاوت کیں، اس کے بعد ڈاکٹر ابوشامہ (جن کی کتاب الاسلام دین ودنیا ہے) نے تمہیدی گفتگو کی، بعد ازاں الاستاذ عبدالصبور مرزوق جو ڈاکٹر عمارہ کے ساتھیوں میں سے ہیں انہوں نے موصوف کا تعارف کرایا اس کے بعد وزیر اوقاف ڈاکٹر محمد حمدی زقزوق نے ابتدائی گفتگو کرتے ہوئے مائیک کو ڈاکٹر عمارہ کے حوالے کیا۔

ڈاکٹر عمارہ شیخ محمد عبدہ کی شخصیت اور ان کی تحریک کے اثرات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، انہوں نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ شیخ محمد عبدہ کی شخصیت کے ہمہ گیر اثرات کا جائزہ لیا، اور اس پہلو پر خصوصاً انہوں نے زور دیا کہ شیخ محمد عبدہ مصر میں علم کے میدان میں جو جمود طاری ہو گیا تھا اسے توڑنے والے علمی اور ثقافتی انقلاب کے نقیبوں میں تھے۔ گفتگو مرتب اور مدلل تھی، شیخ محمد عبدہ کے ساتھ جمال الدین افغانی کا بھی تذکرہ آیا، لیکن وہ ضمنی طور پر تھا، اصل موضوع شیخ محمد عبدہ کی ہی ذات تھی دکتور محمد عمارہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور خطیب ہیں عشاء بعد **مدینة البعوث** کو واپسی ہوئی۔ اس پروگرام میں اللجنۃ العلیا لتدریب الائمۃ، کی اجازت کے بغیر چونکہ بالا بالا شرکت ہوئی تھی۔ لہٰذا اسے محسوس کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہفتہ وزارت الاوقاف کی بس خالی واپس گئی۔ وزارت الاوقاف کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے اللجنۃ العلیا سے رجوع کیا اس طرح باقاعدہ دورہ میں شریک ائمہ کو شرکت کی غرض سے دوبارہ مسجد نور جانا ہوا۔ عشاء سے کچھ پیشتر محاضرہ شروع ہوا۔ عنوان تھا۔ ''عمل کا اخلاقی پہلو'' اس موضوع پر سب سے پہلے خطاب کیا دکتور عبدالباسط شبلی نے خاص طور پر مصر کے وضعی قوانین کا جائزہ لیا۔ اور دستور کے ان دفعات کو پیش کیا جس میں اخلاقی پہلو پر زور دیا گیا ہے، گفتگو مختصر تھی۔

دوسرا محاضرہ اسی موضوع پر دکتور استاذ علی کا ہوا انہوں نے عمل کے اخلاقی پہلو کا تعارف شریعت کی روشنی میں کچھ اس طرح کرایا کہ پورا مجمع ساکت وصامت یکسوئی کے ساتھ سنتا رہا، انہوں نے کہا۔ ''اسلامی اخلاق کی تعلیم کے لئے جذبہ، سنجیدگی اور متانت ضروری ہے کسی چیز میں اصالت اور حسن وجمال پیدا کرنے کے لئے علمی لیاقت کے ساتھ سنجیدگی نہایت اہم شئی ہے۔

اور جدیدیت کے ہوتے ہوئے لا ابالی پن جب فرد اور قومی زندگی میں پائی جائے گی تو ضیاع وقت کے نتیجہ میں ضیاع عمل کا صدور ہوگا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''لَا تَزُوْلُ قَدْ مَا عَبْدٍ حَتّٰی یُسْئَلَ عَنْ عُمْرِہٖ فِیْمَا اَفْنَاہ''

یعنی قیامت کے دن انسانی زندگی کے ایک ایک لمحہ کا حساب لیا جائے گا، اس حدیث سے لاابالی پن کی زندگی کی خطرناکی کا احساس ہوتا ہے کہ ایک ایک سانس کا حساب دینا ہوگا۔ جس مذہب کی یہ تعلیم ہو اس کے افراد میں وقت کے ضیاع کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے؟ لیکن آج صورت حال اس کے برعکس ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ترقی یافتہ ہونے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے یہ ایک سوال ہے کیا اس سوال کے لئے ضروری ہے، یا فوجی اعتبار سے طاقتور ہونا شرط ہے، فرمایا کہ اگر یہ بات ہوتی تو ان ملکوں کو اس فہرست سے نکالنا پڑے گا جن کے یہاں اس کی کمی ہے لیکن ہم جب غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ ہونے کے لئے اس کے علاوہ کچھ اور چیزیں ہیں جن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ حقیقت میں جدیت ہے، جو عبارت ہے اخلاق، اتفاق، مدامت اور امن وامان سے، یہ اوصاف جس فرد میں ہوں گے وہ ترقی کرے گا اور جس قوم میں موجود ہوں گے وہ قوم ترقی کے منازل طے کرتی چلی جائے گی۔ آج اسی کی ضرورت ہے!

دکتور علی محمد کے خطاب کا انداز بڑا پیارا تھا زبان بڑی شستہ اور شگفتہ تھی جو کچھ کہہ رہے تھے مدلل انداز میں اسکی تشریح کر رہے تھے۔ تقریر کے اختتام پر دیر تک تالیاں بجتی رہیں دکتور محمد زقزوق اور دکتور ابوشامہ کے کلمات پر جلسہ کا اختتام ہوا۔

دریائے نیل

دریائے نیل نہایت قدیم تاریخی اور دنیا کا طویل ترین دریا ہے، مصر کی زراعت کا تمام انحصار اسی پر ہے، احادیث مبارکہ میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

فَجَرَتْ اَرْبَعَۃُ اَنْھَارٍ مِنَ الْجَنَّۃِ اَلْفُرَاتُ وَ النِّیْلُ وَ السَّیْحَانُ.

یہ تاریخی دریا قوموں کی عروج وزوال کی نہ جانے کتنی داستانیں اپنی لہروں میں چھپائے ہزارہا سال سے اسی طرح بہہ رہا ہے۔ صحیح احادیث میں اس کو ''جنت کا دریا'' کہا جاتا ہے اور

معراج کی شب جب نبی کریم ﷺ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو آپ ﷺ نے اس کی جڑ میں دو کھلے ہوئے اور دو چھپے ہوئے دریا دیکھے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کے سوال پر بتایا کہ یہ کھلے ہوئے دریا نیل اور فرات ہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب المعراج، حدیث نمبر ۳۸۸۷)

سیحان، جیحان، والفرات، والنیل کل من أنهار الجنة.

(صحیح مسلم، کتاب الجلسہ ص ۲۸۰، ج ۲)

سیحان، جیحان، فرات اور نیل جنت کے دریا ہیں۔

ان دریاؤں کے ''جنت کے دریا'' ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، علماء کرام نے اس کی متعدد تشریحات کی ہیں۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری ص ۲۱۴، ج ۷ کتاب المناقب)

لیکن الفاظ حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اکثر علماء نے اس کی یہی تشریح کی ہے کہ ان دریاؤں کا اصل سرچشمہ جنت ہی کا کوئی دریا ہے۔ رہی یہ بات کہ جنت کے ساتھ ان دریاؤں کے رابطے کی صورت کیا ہے؟ یہ نہ کوئی جانتا ہے نہ اسے حدیث میں بیان کیا گیا، اور نہ اس تحقیق میں پڑھنے کی کوئی ضرورت ہے۔

لیکن اتنی بات واضح ہے کہ دریائے نیل کی کچھ خصوصیات ایسی ہیں جن کی بنا پر وہ دنیا کے دوسرے دریاؤں سے واضح طور پر ممتاز ہے۔

(۱) یہ اپنے طول کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا دریا ہے جو چار ہزار میل میں پھیلا ہوا ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ص ۴۵۱، ج ۱۶۔ مطبوعہ ۱۹۵۰ء مقال "NILE")

(۲) اکثر و بیشتر دریا شمال سے جنوب کی طرف بہتے ہیں۔ لیکن یہ دریا جنوب سے شمال کی طرف بہتا ہے۔ (الخطط المقریزیة، ص: ۱۱۲، ج: ۱)

(۳) یہ بات ہزارہا سال تک محققین کے لیے ایک معمہ بنی رہی ہے کہ اس کا منبع کہاں ہے؟ علامہ مقریزیؒ نے ''الخطط'' میں اس عنوان پر بارہ صفحات لکھے ہیں اور اس میں مختلف آراء اور روایات ذکر کی ہیں جن سے کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس کے منبع کی دریافت کی صدیوں طویل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ بالآخر اب جو نظریہ

مقبول عام ہے وہ یہ کہ یہ دریا یوگنڈا کی جھیل وکٹوریہ سے نکل رہا ہے۔ لیکن برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ یہ بات اس معنی میں تو درست ہے کہ وکٹوریہ جھیل پانی کا وہ سب سے بڑا ذخیرہ ہے جہاں سے نیل نے اپنے چار ہزار میل لمبے سفر کا آغاز کیا ہے۔ لیکن اگر منبع سے مراد سرچشمہ لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ وکٹوریہ جھیل کا پانی کہاں سے آرہا ہے؟ وکٹوریہ کو پانی مہیا کرنے والے ذرائع متعدد ہیں۔ ان میں سے اب تک کاجیرا کی وادی کو نیل کا آخری سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ ابھی تک اس کے سروے کا کام پوری طرح مکمل نہیں ہوسکا۔ اسی لیے مقالہ نگار کے الفاظ ہیں۔

''جغرافیائی تحقیق کے مسائل میں نیل کے منبع کے مسئلے کے سوا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس نے اتنے طویل عرصے تک انسانی تصورات پر اتنی شدت کے ساتھ اثر ڈالا ہو۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، حوالہ بالا، ص ۴۵۵، ج ۱۶)

اگر انسان اتنی ہزار سال کی تحقیق اور ریسرچ کے بعد دنیا ہی میں اس دریا کا آخری سرا سو فی صد یقین کے ساتھ دریافت نہیں کرسکا تو صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کے ساتھ اس کے جس رابطے کی نشان دہی فرمائی ہے اس کا ٹھیک ٹھیک سراغ کون لگا سکتا ہے؟

کتب خانہ مصر

مصر عربی دینی کتب کی اشاعت کا بڑا عظیم مرکز رہا ہے اور وہاں سے ہر دینی موضوع پر اتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں کہ ان کی گنتی مشکل ہے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ یہاں کے کتب خانے اپنی ماضی کی روایات کھوتے جارہے ہیں۔ ان شہرۂ آفاق کتب خانوں میں جانا ہوا جنھوں نے بلامبالغہ ہزاروں کتابیں شائع کی ہیں۔ لیکن اب ان کی مطبوعات کا ذخیرہ بہت کم ہے، دارالمعارف جیسا ادارہ جس نے ماضی میں گراں قدر علمی کتابوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے، اب زیادہ تر ناول اور افسانے شائع کررہا ہے۔ اور اس کی قدیم مطبوعات نایاب ہوچکی ہیں۔ تاہم اس گئی گذری حالت میں بھی مصر علمی کتابوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ ''عیسیٰ البابی''، ''مصطفیٰ البابی'' اور ''محمد علی صبیح''، جن کا نام ہمیشہ کتابوں پر پڑھتے آئے تھے، ان کتب خانوں کی حالت اتنی خستہ ہے

کہ وہ دیکھنے میں کباڑ خانے معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر ڈھونڈنے والے کے پاس وقت ہو اور وہ ریت مٹی کی پروا کیے بغیر ان کی الماریوں میں گھس جائے تو اسے اب بھی بہت سے گوہر نایاب ہاتھ آجاتے ہیں، چنانچہ بحمد اللہ بہت سی وہ نادر کتابیں جن کی عرصے سے تلاش تھی، ان کتب خانوں سے مل ہی گئیں۔ (جہانِ دیدہ، ص:۱۲۸)

صلاح الدین ایوبیؒ کا قلعہ

حدیقۃ الازہر کے پاس رستا دل ہے جو صلاح الدین ایوبی کا قلعہ ہے یہ کافی لمبا چوڑا قلعہ ہے اس کے اندر پولیس میوزیم اور ملٹری میوزیم ہے۔

اس میں مسجد محمد علی اور مسجد سلطان حسن ہے اس میں سے ایک مسجد میں ہم گئے تو کوئی پروگرام چل رہا تھا اس قلعہ کو رستا دل کہتے ہیں اندر جانے کے لیے ۶۰ر مصری پاؤنڈ ٹکٹ ہے۔ المتحف الحربی القومی (The National Millitary Museum) اس میں ہے۔ مسجد محمد علی ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء میں بنی ہے۔ جس کو محمد علی بادشاہ نے بنوایا تھا جس کی تعمیر میں ۱۸ر سال لگ گئے تھے اس مسجد کو تقریباً ۱۸۳ر سال ہو چکے ہیں۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

سور العیون کے ساتھ ساتھ چلیں تو یہ جس قلعے پر جا کر ختم ہوتی ہے، وہ ایک قلعہ ہے جو سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۵۷۲ھ میں بنایا تھا، اور اس کو اپنی رہائش گاہ کے طور پر اختیار کیا تھا، یہ قلعہ چوں کہ ایک پہاڑی پر واقع ہے اس لیے قدیم عربی کتب میں اس کا ذکر ''قلعہ الجبل'' کے نام سے ملتا ہے۔ اس کی فصیل کی پیائش ستائیس ہزار تین سو ذراع ذکر کی گئی ہے۔

(النجوم الزاہرۃ ص:۵۴، ج:۶۔ احوال ۵۶۷ھ)

عرصہ دراز تک یہ قلعہ مصر کے دارالحکومت کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ سرکاری دفاتر اسی قلعے میں واقع تھے۔ بعد میں محمد علی پاشا نے یہاں ایک شاندار جامع مسجد اور دوسری عمارتیں بنائی اور یہ قلعہ فوجی چھاؤنی کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ اب اسے سیاحوں کے لیے بھی کھول دیا گیا ہے۔

(جہانِ دیدہ ص:۱۲۸)

جیزہ کا سفر

صبح نو بجے مدینۃ البعوث کی خاص گاڑی منی بس کے ذریعہ جیزہ کو روانگی ہوئی **اللجنة العليا** کے امین جناب مجاہد متولی نے پہلے تمام رفقاء کو بس میں آکر دیکھا چونکہ بس بھری تھی سب کے لئے اس میں سیٹیں ناکافی تھیں اس لئے چند کرسیاں درمیان میں ڈال دی گئیں تاکہ جن لوگوں کو سیٹ نہیں مل سکی وہ اس پر بیٹھ جائیں **أمين اللجنة** نے الوداع کہا اور ہم سب جیزہ کے لئے روانہ ہوگئے۔

ہمراہ جناب فتحی اور رجب صاحبان بھی تھے فتحی کے ذمہ قاعدۃ الحاضرہ کی نگرانی اور شرکاء کی دیگر ضرورتوں کی ذمہ داری بھی تھی، رجب کی حیثیت چپراسی کی ہے، دونوں ہی سے ہم سب گھل مل گئے تھے، وہ بھی ہم لوگوں کا خیال رکھتے تھے۔

جیزہ دریائے نیل کے مغربی جانب وہ مقام ہے جہاں فرعونی عہد کے عظیم باقیات پائے جاتے ہیں، دریائے نیل کے اس پار شہر کا بڑا حصہ دور تک پھیلا ہوا ہے، لیکن وہ بھی قاہرہ ہی میں شامل ہے، مغربی اور مشرقی دونوں حصوں میں دریائے نیل کی ایک چھوٹی سی شاخ الگ ہوکر نکلی ہے اس کے درمیانی حصہ کو منیل کہا جاتا ہے، اس حصہ میں گنجان آبادی ہے، بڑے بڑے رہائشی کئی منزلہ مکانات ہیں اور تجارتی منڈیاں بھی ہیں منیل سے ہوتے ہوئے دریا نیل پہونچے، دریائے نیل کا منظر بہت دلکش وخوبصورت ہے اس کے دونوں جانب خوبصورت اونچے اونچے ہوٹل اور سرکاری عمارتیں بنی ہوئی ہیں قاہرہ ریڈیو اسٹیشن کی عظیم الشان عمارتیں بھی دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر واقع ہیں جس میں ڈاکٹر عبدالمجید ندوی اور ان کی اہلیہ، مولوی عزیر عالم ندوی، عبدالسمیع ندوی، مولوی انوار اللہ ندوی اور مولوی امتیاز قاسمی صاحبان پروگرام ترتیب دیتے ہیں ٹھیک اس کے مغربی کنارے پر منارہ نظر آتا ہے، اس میں روشنی کا مخصوص نظم کیا گیا ہے، جس سے اس کا حسن مزید نکھر جاتا ہے دریائے نیل میں رنگ برنگ کی کشتیاں نظر آئیں جن پر شام کے وقت سیر وتفریح کرنے والوں کی بھیڑ ہوتی ہے فی کس دو پونڈ یا کم از کم ایک پونڈ مصری اس پر سواری کے لئے دینا پڑتا ہے۔ دریائے نیل کی گہرائی اتنی ہے کہ بڑے بڑے تیرتے ہوئے ہوٹل جو کئی کئی منزلہ ہوتے

ہیں، اس میں لنگر انداز ہوتے ہیں، شام میں ان کی رونق بڑھ جاتی ہے، ان میں عیش وعشرت کی ساری چیزیں فراہم کی جاتی ہیں دریائے نیل کا مغربی حصہ خوبصورت بنا ہوا ہے حکومت مزید اس حصہ کی جدید کاری کر رہی ہے، خوبصورت پارک اور اس میں تناسب کے ساتھ کیاریاں اور راہدار نالیاں بنی ہوئی ہیں، لائیٹنگ کی وجہ سے وہ پورا حصہ فردوس بداماں محسوس ہوتا ہے۔ منچلوں کی بھیڑ سمٹ کر اس فردوس ارضی میں آجاتی ہے۔ بہر کیف تفریح کا ہر سامان دریائے نیل کے کنارے موجود ہے دریائے نیل کا پانی دریائے گومتی لکھنؤ سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن دریائے گومتی سے کہیں زیادہ صاف وشفاف پانی دریائے نیل کا ہے، پانی کی سطح کناروں تک قائم رہتی ہے۔

چونکہ قاہرہ میں بارش نہیں ہوتی۔ اس لئے سیلاب یا کناروں کے پھیلنے یا دریا کے رخ بدلنے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ پورے مصر میں بارش نہیں ہوتی ہے اسکندریہ کی طرف کبھی معمولی بارش ہو جاتی ہے۔ مصر میں کاشت وزراعت باغبانی اور ہریالی کا واحد ذریعہ دریائے نیل ہے۔ جنوب سے شمال تک پھیلا ہوا دریائے نیل اسکندریہ کے پاس بحرابیض متوسط میں جا کر گرتا ہے، مصر کے مشہور شہر اسوان، اقصر، ططا، منصورہ، قاہرہ اور اسکندریہ یہ سب اسی کے کنارے واقع ہے۔ دریائے نیل کے ذریعہ مصری حکومت نے خصوصی آبپاشی کا نظام بھی شروع کیا ہے شمال مشرق کے حصہ میں دریائے نیل کے پانی سے گیہوں اور دھان کی کاشت ہوتی ہے دھان کی پیداوار اتنی ہے کہ حکومت فاضل ذخیرہ ایکسپورٹ بھی کرتی ہے۔

اہرامات

''عہد قدیم میں دنیا کے جو سات عجائب مشہور تھے ان میں سے اہرام مصر ہی تنہا وہ عجوبہ ہے جو آج تک باقی چلا آتا ہے۔ ہزاروں سال قبل مسیح (علیہ السلام) بنی ہوئی یہ حیرت انگیز عمارتیں آج بھی انجینئرنگ کی تاریخ کا عجوبہ سمجھی جاتی ہیں۔ اور آج جب کہ انجینئرنگ اپنے بامِ عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ ''الہرم الاکبر'' اس دور میں بھی اپنے طول وعرض اور اونچائی کے لحاظ سے دنیا کی اونچی بڑی عمارت ہے۔

یہ عمارت کس نے اور کیوں بنائی تھی؟ اس کے بارے میں تاریخی روایات اس قدر مختلف

ہیں کہ ان کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ مصر کے مشہور مؤرخ علامہ مقریزیؒ لکھتے ہیں۔

وقد اختلف الناس في وقت بناء ها، واسم بانيها، والسبب في بنائها، وقالوا في ذلك أقوالا متباينة أكثرها غير صحيح.

لوگوں کے درمیان اہرام کی تاریخ تعمیر، اس کے بانی کے نام- اور تعمیر کے سبب کے بارے میں اختلاف ہے، اور اس سلسلے میں متضاد اقوال ہیں جن میں سے اکثر صحیح نہیں۔

(الخطط المقريزية، ص:۱۹۸، ج:۱)

لیکن قدیم عربی مآخذ میں اس سلسلے میں جو روایت زیادہ مشہور ہے وہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان سے پہلے مصر کے ایک بادشاہ سوریدؔ نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر بعض کاہنوں اور نجومیوں نے یہ دی کہ دنیا پر ایک عالمگیر مصیبت آنے والی ہے۔ سوریدؔ نے اس موقع پر اہرام کی تعمیر کا حکم دیا اور اس کے اندر کچھ ایسی سرنگیں بنائی تھیں جن سے دریائے نیل کا پانی داخل ہو کر کسی خاص جگہ تک جا سکے، نیز اس عمارت میں طرح طرح کے عجائب شامل کیے تھے اور اس وقت اہلِ مصر سائنس اور حساب سے لے کر طب اور سحر تک جتنے علوم سے واقف تھے ان کو اس عمارت کی دیواروں، چھتوں اور ستونوں پر لکھ کر محفوظ کیا تھا۔ بعد میں اسی عمارت کو بادشاہوں کے مقبروں کے طور پر بھی استعمال کیا گیا۔ (حسن الحاضرة للسيوطي، ص:۳۳ تا ۳۵)

ایک روایت یہ ہے کہ اہرام کا بانی قوم عادؔ کا ایک بادشاہ شداد تھا اور بعض روایتوں میں حضرت ادریس علیہ السلام کو ان کا بانی قرار دیا گیا ہے۔ (الخطط المقريزية، ص:۲۱۰، ج:۱)

ان عمارتوں کے بارے میں طرح طرح کے طلسماتی کہانیاں بھی مشہور رہی ہیں، جو علامہ سیوطیؒ اور علامہ مقریزیؒ نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔

لیکن عہدِ جدید میں آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے مختلف کھدائیوں اور دریافت شدہ تحریروں کی تحقیق کے بعد جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ اہرام مصر دراصل عہد قدیم میں بادشاہوں کے مقبروں کے طور پر تعمیر کیے گئے تھے۔ اس دور میں بادشاہوں کے مقبرے اسی مخروطی شکل میں تعمیر کیے جاتے تھے، اور فراعنہ کے چوتھے سے لے کر سترھویں خاندان تک مقبروں کا یہی اسلوب

مقبول عام رہا، چنانچہ مصر کے مختلف حصوں میں بہت سے اہرام تعمیر کیے گئے چنانچہ اسی اہرام کے آثار دریائے نیل کے مغربی علاقے اور مصر کے زیریں اور وسطی خطوں میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ اہرام زیادہ تر معمولی سائز کے تھے اور انھیں مخروطی شکل دینے کے لیے سیڑھیوں کا سا انداز اختیار کیا گیا تھا، ان کو "اہرام الصادقۃ" (True Pyramids) کہا جاتا ہے۔ ان اہرام میں سے قدیم ترین مقبرہ شہر صقرہ سے چند میل جنوب میں واقع ہے اور کہا جاتا ہے کہ شاہ اسنیفرد نے ۲۶۰۰ق م میں تعمیر کیا تھا، جو فراعنہ کے چوتھے شاہی خاندان کا ایک بادشاہ تھا۔

(Encyclopaedia International Lexican 1982 Vol. 15, P. 194)

لیکن یہ اہرام اپنی قدامت کے باوجود فن تعمیر کے نقطۂ نظر سے کوئی عجوبہ قرار نہیں دیئے گئے۔ بعد میں تین اہرام قاہرہ کے قریب جیزہ کے علاقے میں (جو اب قاہرہ ہی کا حصہ بن گیا ہے) تعمیر کیے گئے۔ یہ اپنے سائز کے اعتبار سے بھی غیر معمولی تھے اور ان کو مخروطی شکل دینے کے لیے سیڑھیوں کا سا انداز بھی اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ نیچے سے اوپر تک سطح کو سپاٹ رکھتے ہوئے انھیں مخروطی شکل دی گئی۔ یہی تین اہرام دنیا کے عجائب میں شمار ہوتے ہیں۔ اور آج بھی دنیا بھر کے سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔

جدید تحقیق کے مطابق یہ تین اہرام حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے فراعنہ کے چوتھے خاندان کے بادشاہ، خوفو اور اس کے بیٹوں خفرے اور منکارہ نے تعمیر کیے تھے۔ ان میں سب سے بڑی عمارت "الہرم الاکبر" کہلاتی ہے اور وہ خوفو نے تعمیر کی تھی۔ زمین پر اس کا مجموعی رقبہ ۱۳ء۱ (تیرہ اعشاریہ ایک) ایکڑ ہے اور صرف ایک سمت سے زمین پر اس کا طول ۷۵۶ فٹ ہے۔ تیار ہونے کے بعد اس کی اونچائی ۴ء۴۸۱ فٹ تھی۔ بعد میں کچھ بالائی حصہ کم ہو گیا تو اونچائی ۳۱ فٹ کم ہو گئی۔ اس کی تعمیر میں بیس لاکھ سے زیادہ پتھر کے بلاک استعمال ہوئے ہیں۔ جن میں سے کوئی پتھر ۲ ٹن سے کم نہیں ہے۔ بعض پتھر ۱۵ ٹن وزنی بھی ہیں۔ لیکن اوسطاً پتھروں کا وزن ڈھائی ٹن ہے۔ لیکن ان پتھروں کو ایسی فن کاری کے ساتھ جوڑا گیا ہے کہ ان کی درمیانی جھری باہر سے نظر ہی نہیں آتی۔ اور دور سے پوری عمارت ایک ہی دیوہیکل مخروطی پتھر معلوم ہوتی ہے۔

ایک امریکی ماہر آثارِ قدیمہ ڈیسمنڈ اسٹیورٹ نے اہرام مصر پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے اس میں وہ لکھتا ہے:

''دنیا بھر میں پتھر کی یہ سب سے بڑی تعمیر تیرہ ایکڑ کے رقبے میں کھڑی ہے، جو بیس لاکھ سے زائد بلاکوں پر مشتمل ہے اور یہ بلاک اوسطاً ڈھائی ٹن وزنی ہیں۔ اس کی ہر سمت ۷۵۵ فٹ طویل ہے، لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تمام کونے مکمل طور پر بالکل صحیح زاویہ بناتے ہیں اور سامنے کے پتھر اتنے ٹھیک ٹھیک نصب کیے گئے ہیں کہ ان کے درمیانی جوڑ نظر نہیں آتے۔''

(Desmnod Stewant, The Pyramid and Sprinx, New York 1978, P.166)

ہم ''الہرم الاکبر'' کے نیچے پہنچے تو اس کے تقریباً بیچوں بیچ زمین سے ذرا بلندی پر ایک غار نما دروازہ نظر آیا جو ایک سرنگ میں کھلتا ہے، یہ سرنگ اندر ہی اندر ہرم کی چوٹی تک چڑھتی ہوئی گئی ہے۔ عربی تاریخوں کے مطابق یہ ہرم کا باقاعدہ دروازہ نہیں ہے، بلکہ خلیفہ مامون رشید نے اپنے عہد حکومت میں اہرام مصر کے اندرونی راز معلوم کرنے کے لیے ہرم اکبر کے بیچ سے کھدائی کا حکم دیا تھا، اور اس دور میں صرف اتنے حصے کی کھدائی پر بڑی دولت صرف کی گئی تھی، اور اس کے لیے آگ اور سرکے سے لے کر منجنیقوں تک کو استعمال کیا گیا تھا، کھدائی سے معلوم ہوا کہ دیوار کا اندرونی حجم بیس ہاتھ ہے۔ چنانچہ بیس ہاتھ کی کھدائی مکمل ہوئی تو اتفاق سے یہ وہی جگہ تھی جہاں سے سرنگ اوپر کی طرف جارہی تھی، وہاں زبرجد کی ایک سلیجی بھی رکھی ہوئی ملی جس میں ایک ہزار دینار رکھے تھے جن میں سے ایک کا وزن ایک اوقیہ تھا۔ بعد میں جب مامون رشید نے کھدائی کے مجموعی خرچ کا حساب لگایا تو وہ اتنے ہی دینار کے برابر تھا۔

(الخطط المقریزیة، ص:۲۰۱، ج:۱، وحسن المحاضرة للسیوطیؒ، ص:۳۴، ۳۵)

اس سرنگ کی چڑھائی خاصی دشوار گذار ہے، چڑھائی کی مشقت اور گرمی کی شدت سے لوگ اوپر پہنچتے پہنچتے پسینے میں شرابور ہوجاتے ہیں۔ اس سرنگ کی انتہا ایک وسیع وعریض ہال پر ہوتی ہے۔ جس کی تمام تر دیواریں پتھر کی ہیں۔ اس کے شمال مغربی کونے میں پتھر کا ایک حوض بنا

ہوا ہے۔ اس حوض میں بادشاہ کی لاش رکھی جاتی تھی، تاریخوں میں لکھا ہے کہ ہرم کی دیواروں پر عجیب وغریب رسم الخط کی عبارتیں تحریر تھیں جو مرورِ زمانہ سے مٹ گئی ہیں۔ نیز دیواروں کو طرح طرح کے نقوش اور لعل وجواہر سے مزین کیا گیا تھا، اب ان میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

ہرم اکبر کے بعد دوسرے نمبر پر ''ہرم اوسط'' ہے، نیچے کھڑے ہوکر دیکھیں تو یہ زیادہ بڑا معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقۃً ہرم اکبر سے چھوٹا ہے، یہ تعمیر کے وقت ۴۷۱ فٹ بلند تھا، اور اب اس کی اونچائی ۴۴۷ فٹ ہے۔ یہ خوفو کے بیٹے خضرے کا بنایا ہوا ہے جو شیفرن (Chephren) کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔

تیسرا ہرم ''ہرم اصغر'' ہے یہ تعمیر کے وقت ۲۱۸ فٹ بلند تھا اور اب ۲۰۴ فٹ بلند ہے اور یہ خیفرے جانشین منکارہ کا تعمیر کردہ ہے، جو مائی سرینوس کے نام سے معروف ہے، یہ تینوں اہرام چوں کہ قاہرہ کی عام سطحِ زمین سے کافی بلند ہیں۔ اس لیے یہاں سے شہر قاہرہ کا منظر بھی بڑا خوشنما ہے اور یہاں ہر وقت سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ فقیہ عمارۃ الیمنیؒ نے اہرام مصر کے بارے میں کہا ہے۔

خليلي ما تحت السماء بنية ... مماثل في اتقانها هرمي مصر

بناء يخاف الدهر منه وكل ما ... علي ظاهر الدنيا يخاف من الدهر

تنزه طرفي في بديع بناءها ... ولم ينزه في المراد بها فكري

میرے خیال میں اہرام مصر جیسے عجوبے پر اس سے بہتر اور متوازن تبصرہ نہیں ہوسکتا۔ (اشعار کا ترجمہ یہ ہے: دوستوں؟ آسمان کے نیچے کوئی عمارت ایسی نہیں جو اپنے استحکام میں مصر کے دو ہرموں کے مشابہ ہو۔ یہ ایسی عمارت ہے جس سے زمانہ بھی ڈرتا ہے۔ حالاں کہ روئے زمین کی دوسری چیزیں زمانے سے ڈرتی ہیں، میری آنکھ اس عجیب وغریب عمارت کو دیکھ کر محظوظ ہوتی ہے۔ لیکن یہ عمارت جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اس کے تصور سے میرا ذہن محظوظ نہیں ہوتا۔)

جیزہ کے وسیع اور طویل شاہراہ سے ہوتے ہوئے ہم لوگ اہرامات کے حدود میں داخل

ہوئے، یہ حصہ نسبتاً کم اونچی پہاڑی سلسلہ ہے، وہاں سے پورا قاہرہ نشیب میں نظر آتا ہے۔ اہرامات کے مخروطی شکل کے پہاڑ نما مقبرے مین جو عہد فراعنہ میں تعمیر کئے گئے ہیں، خالص رمادی پتھر سے اہرامات کی تعمیر ہوئی ہے، پتھروں کی بڑی بڑی چٹانوں کو کس طرح اوپر تک پہونچایا گیا ہے یہ بھی ایک تعجب خیز بات ہے۔ پھر دو چٹانوں کے جوڑنے میں کوئی مسالہ بھی استعمال نہیں ہوا ہے، چٹانوں کو تراش کر اس طرح جوڑ دیا گیا ہے کہ ادھر ادھر کھسکنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا، کہا جاتا ہے کہ یہ موجودہ اہرامات کی تعداد چار ہے، ان کی تعمیر کا زمانہ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے بھی پہلے ہے، اہرامات کے اندر میت کے لئے کھانے پینے کی چیزیں بھی رکھی جاتی تھیں، اور اس فن میں اتنے وہ ماہر تھے کہ رکھی ہوئی چیزیں صدیاں گذر جانے کے بعد بھی خراب نہیں ہوتی تھیں، فرعونیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ مردہ جب اٹھے گا تو اس کو کھانے پینے کی حاجت ہوگی، لہٰذا اس کی قبر بنانے میں اس کی بھی رعایت کی جاتی تھی کہ اس کے لئے مفروشات وملبوسات یہاں تک کہ آرام کرنے کے لئے کمرہ اور فرنیچر وغیرہ بھی اس میں رکھتے تھے۔

لہٰذا قبرستان ایک چھوٹا سا رہائشی فلیٹ ہوتا تھا، ان اہرامات کی تعمیر میں ان مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے، لاش کے مومیانے میں بھی اہل مصر کو خاصی مہارت وشہرت حاصل تھی، بعض اہرامات کی اونچائی ساڑھے چار سو فٹ سے بھی زائد ہے۔ ایک اہرام سے دوسرے اہرام تک ایک فرلانگ کا فاصلہ ہے۔ آس پاس اور چھوٹے چھوٹے قدیم مقابر کی عمارتیں ہیں، سیاحوں کی کثرت ہوتی ہے، مصری اور غیر مصری دونوں ہی ہوتے ہیں۔

ہم جب وہاں پہنچے تو برائے نام یوروپین سیاح نظر آئے، اونٹ اور گھوڑے پر بیٹھ کر ایک اہرام سے دوسرے اہرام تک جانے کے لئے دس پونڈ مصری تقریباً سو روپے ہندوستانی دینے پڑتے ہیں۔ چونکہ ہم لوگ ازہر شریف کے مہمان تھے، لہٰذا گاڑی اندر لے جانے کی اجازت مل گئی، تین اہرامات کو ہم نے قریب سے دیکھا، اندر جانے کی اہرام میں کوشش کی گئی لیکن وہاں کچھ کام چل رہا تھا، لہٰذا جانے کی اجازت نہیں ملی، دوسرے اور پہلے اہرام میں داخلہ کے لئے دس سے بیس پونڈ تک مزید دینے پڑتے ہیں۔ اسلئے اس کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔

ابوالھول

اہرامِ جیزہ کے مشرقی جانب میں شہرۂ آفاق ''ابوالہول'' واقع ہے، یہ دراصل ہرم اوسط کے بانی خفرے کا مجسمہ ہے جو اس نے خود اپنی زندگی میں بنوایا تھا۔ مقریزیؒ نے لکھا ہے کہ اس کا قدیم نام ''بیلبیب'' تھا، عربوں نے اس کا نام ''ابوالہول'' رکھ دیا۔ مقریزیؒ کے زمانے میں اس مجسمے کا سر اور گردن سطحِ زمین پر نظر آتی تھی، اور لوگوں کا قیاس یہ تھا کہ باقی جسم زمین میں مدفون ہے۔ چنانچہ بعد میں کسی وقت زمین کھودی گئی تو قیاس درست نکلا، اب اس کے چاروں طرف زمین کھدی ہوئی ہے اور پورا مجسمہ نظر آتا ہے۔ البتہ چہرے کے نمایاں نقوش مٹے ہوئے ہیں اور مقریزیؒ نے لکھا ہے کہ ہمارے زمانے میں ایک صوفی بزرگ شیخ محمدؒ تھے جو ہمیشہ روزے سے رہتے تھے۔ انھوں نے مصر میں بہت سے منکرات کے ازالے کے لیے ایک مہم شروع کی اور اسی مہم کے دوران انھوں نے ابوالہول کے چہرے کو اس طرح بگاڑ دیا کہ چہرے کے نقوش نظر نہ آئیں۔ (الخطط ص:۲۱۷، ج:۱)

بہرکیف! یہ مجسمہ ۲۴ رفٹ لمبا اور ۶۶ رفٹ اونچا ہے۔ اس کی ناک قدِ آدم ہے۔ اور ہونٹ ۷ رفٹ سے زائد لمبے ہیں۔ چہرہ مردانہ ہے۔ لیکن دھڑ شیر جیسا ہے اور یہ پورا مجسمہ ایک ہی پتھر کا بنا ہوا ہے۔

تاریخی روایات اس بات پر متفق ہیں کہ اہرام اور ابوالہول کے لیے پتھر اسوان کے علاقے سے لائے گئے تھے، جہاں آج کل اسوان بند تعمیر کیا گیا ہے۔

ابوالہول کے دائیں جانب ایک زیرِ زمین قلعہ نما عمارت کے کھنڈر ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فرعونوں کے زمانے میں شہزادیوں کے کمرے تھے۔'' (جہانِ دیدہ ص:۸۸)

ابوالہول تک پہونچنے کے لئے وادی میں بنے ہوئے معبد کی راہداریوں سے گذرنا پڑتا ہے، یہاں پر حکومت کی طرف سے لائٹ اور ساؤنڈ کے ذریعہ فرعونی تہذیب کو بھی ہر شام پیش کیا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ پروگرام انگریزی، فرانسیسی اور جاپانی زبانوں میں ہوتا ہے، وادی کے اوپر ابوالہول کے بالکل سامنے سیاحوں کے لئے نشستوں کا نظم ہے، ابوالہول سے فارغ ہوکر ہم قریب

کے مارکیٹ چلے گئے وہاں پر فرعونی آثار کی تصویریں برائے فروخت موجود تھیں ہم صرف دیکھ کر واپس ہو گئے۔

قلعہ محمد علی

اہرامات جانے سے قبل ہم قلعہ محمد علی دیکھنے گئے، قلعہ کا وہ حصہ جس کی تعمیر سلطان صلاح الدین ایوبی نے شروع کیا تھا اور ان کی وفات کے بعد ملک عادل نے اسے مکمل کیا، اس میں بہت سے خانات مسجدیں اور فوجی بیرکیں بنی ہوئی ہیں، اس دور کے اسلحے، زرہیں، بندوقیں اور دیگر اشیاء اس قلعہ میں محفوظ ہیں، اس وقت قلعہ کا وہ حصہ کسی وجہ سے بند تھا اس لئے یہ چیزیں ہم نہیں دیکھ سکے جس کا بڑا افسوس ہے۔

قلعہ کے شمالی حصہ میں محمد علی باشا کی بنائی ہوئی عالیشان مسجد ہے جس کی تعمیر تقریباً پندرہ سال میں ۱۸۳۰ء میں مکمل ہوئی، مسجد کا اندرونی حصہ بیش بہا شیشوں سے مزین ہے، بڑے اور قیمتی جھاڑ فانوس لگے ہوئے ہیں، پوری مسجد استنبول کی ایا صوفیہ کے طرز پر بنی ہوئی ہے، مسجد کا منبر انتہائی مرصع ہے، خالص سونے کے پانی سے پالش کیا ہوا ہے، اس لئے اسے چھونے کی اجازت نہیں ہے، مسجد میں سرخ قالین بچھی ہوئی ہے، محراب کے بائیں طرف ایک چھوٹا سا لکڑی کا مرصع مدور منبر رکھا ہوا ہے، اس کو مرکز المبلغ کہتے ہیں، جمعہ کے علاوہ اس کو وعظ وارشاد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، مسجد کا مرکزی حصہ اس بڑے گنبد کے زیر سایہ ہے جس کی تزئین آج بھی نظروں کو خیرہ کرتی ہے۔ مسجد دیکھنے کے لئے انسانوں کا ایک سیلاب آتا ہوا ہر آن دکھائی پڑتا ہے، لیکن افسوس کوئی دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھتے ہوئے دکھائی نہیں پڑتا، ایک تفریح گاہ ہے جہاں نوجوان جوڑوں کی بھیڑ ہوتی ہے اور مختلف زاویوں سے تصویریں لینے میں بھی منافست نظر آتی ہے۔ سیاحوں میں یوروپین بھی بڑی تعداد میں ہوتے ہیں۔

مسجد کے شمال مغرب کے کونے پر محمد علی پاشا کی قبر بنی ہوئی ہے جس پر نفیس قسم کی جالی لگی ہوئی ہے اور سبز رنگ کی مرصع چادر سے ڈھکی ہوئی ہے، وہاں بھی تصویر لینے والوں کی بھیڑ نظر آتی ہے، لیکن کوئی فاتحہ پڑھنے والا دکھائی نہیں پڑتا، ہم اس قبر پر گئے اور فاتحہ پڑھ کر واپس

ہوئے اور ذہن میں یہ خیال غالب ہو رہا تھا کہ انسان کی زندگی اور اس کے جاہ وحشم کی کیا حقیقت ہے، یہی وہ محمد علی پاشا ہے جو البانیہ میں پیدا ہوا، عثمانی فوج میں بہتر کارکردگی کی وجہ سے اسے مصر کی مہم پر روانہ کیا گیا، اس نے اپنی فوجی مہارت، جرأت، لیاقت کی وجہ سے اس مہم میں کامیابی حاصل کی اور ترکی سلطنت میں مصر کا اضافہ کیا، اس کے پہلے مصر میں ممالک کی حکومت قائم تھی، محمد علی پاشا کو مصر میں آزاد خود مختار حکومت کا بانی ومؤسس سمجھا جاتا ہے، اس کے زمانہ میں مصر نے ترقی کی اور اس کی حیثیت خود ایک ملک کی ہوگئی، لہٰذا محمد علی پاشا کا اسٹیچو آج بھی عتبہ میں لگا ہوا ہے، عتبہ یہاں کا مشہور بازار ہے، جو تحریر (آزاد چوک) کے بازو میں واقع ہے اور دیارئے نیل سے قریب ہے۔

قصر جوھرہ، محمد علی باشا کا ایوان خاص

مسجد سے گذر کر جنوبی حصہ میں ایک قدیم عمارت کی طرف ہم کو لے جایا گیا، اسے قصر جوہرہ کہتے ہیں۔ یہی وہ محل تھا جس میں محمد علی پاشا قیام پذیر تھا۔ اس میں اس کی متروکات خصوصا وہ عطیات جو بادشاہوں کی طرف سے اسے ملے ہیں۔ ان میں سے بعض محفوظ ہیں مثلاً کرسیاں، اور دیگر فرنیچر شاہ چین کی طرف سے نذر کردہ ہیں جبکہ ایک چھوٹی سی الماری جس کے اوپر ایک گھڑی لگی ہوئی کہا جاتا ہے اس کو شاہ فرانس نے تحفہ کے طور پر بھیجا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ شاہی محل کے درجہ حرارت کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ ہم سب سے پہلے اس ہال میں پہنچے جسے دربار خاص یا ایوان خاص ''البھو الرئیسی'' کہا جاتا ہے۔ اس محل کی تعمیر ۱۸۱۱ء تا ۱۸۱۴ء کے درمیان ہوئی۔ اس کے بعض حصہ میں ۱۹۰۶ء میں آگ لگ گئی تھی جس کی تجدید ۱۹۸۳ء میں مکمل ہوئی ہے۔ اس ایوان میں محمد علی پاشا کا تخت بھی ہے جہاں اس کا دربار لگتا تھا۔ اور مخصوص وزراء اور مشیر کار جہاں بار پاتے تھے اس کو مصری حکومت نے مجسموں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ درمیان میں محمد علی پاشا بیٹھے ہوئے اپنے مشیروں سے مشورہ کر رہے ہیں۔ بائیں طرف شیخ الازہر اور مفتی جمہوریہ ہیں اور داہنی طرف دو ترکی کے مشیر بیٹھے ہوئے ہیں۔ دو مقامی شہریوں اور دو دیہات کے نمائندے ہیں ایک ترجمان محمد علی پاشا کے سامنے کھڑا ہے۔ جو ترکی

میں عربی سے ترجمہ کے بعد درخواستیں پیش کرتا ہے۔ اسٹیچو کے ذریعہ اس کی منظر کشی کی گئی ہے۔ لیکن انداز بھونڈا ہے مضحکہ خیز منظر معلوم ہوتا ہے۔ ترجمان کے ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا دفتی کا ڈبہ لٹکا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ہال متوسط درجہ کا ہے۔ چھت مرصع اور در ودیوار کو خوبصورت نقش ونگار سے مزین کیا گیا ہے۔ لیکن اس میں وہ شکوہ نہیں جو لال قلعہ کے ایوان خاص میں نظر آتا ہے۔ ''**البھوالرئیسی**'' کے دوسرے جانب مصر کے سلاطین کی روغنی تصویریں آویزاں ہیں۔ اس میں ایک تصویر شاہ محمد فاروق کی بھی ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو جس طرف سے دیکھئے ایسا معلوم ہوتا وہ اس طرف متوجہ ہیں۔

• شاہان مصر کے بعض دیگر مفروشات اور استعمال کردہ اشیاء بھی وہاں رکھی ہوئی ہیں، یہ حصہ عام سیاحوں اور زائرین کے لئے نہیں کھولا جاتا لیکن ہم لوگوں کے ساتھ خصوصی معاملہ کیا گیا اور اس حصہ کی بھی زیارت حاصل ہوگئی، اس کے بازو میں وہ خوابگاہ ہے جس کو خدیوا اسماعیل کی مسہری، دیگر مفروشات اور خوانگی اشیاء کے ساتھ محفوظ کر دیا گیا ہے اس کو دیکھ کر بے ساختہ قرآن پاک کی یہ آیت یاد آئی۔

'' كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ وَ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ وَ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ''

''وہ لوگ بہت سے باغ اور چشمے چھوڑ گئے اور کھیتیاں اور نفیس باغ اور آرام کی چیزیں جن میں عیش کیا کرتے تھے''۔ (سورہ دخان، ۲۵-۲۶-۲۷)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو فرعون گذرا ہے اس کو رعمسیس ثالث کہا جاتا ہے، قاہرہ میں تحریر کے پاس رعمسیس نام سے ایک مشہور بازار بھی ہے، مصر میں فراعنہ کے آثار بہت سے محفوظ ہیں اور حکومت ان کی حفاظت پر بھی بہت توجہ دیتی ہے، اس لئے کہ آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ قبطی دور کے یہ آثار ہیں یوروپین سیاح عام طور پر یہی آثار دیکھنے کے لئے مصر کا قصد کرتے ہیں، سب سے زیادہ مصر میں فراعنہ دور کے آثار الاقصر میں واقع ہیں۔ الاقصر قاہرہ سے جنوب میں تقریباً سات سو کلومیٹر پر دریائے نیل کے کنارے ایک تاریخی قدیم شہر ہے۔

الاقصر

دکتور عراقی جن کا "الحضارة الاسلامية" کے عنوان سے جمعرات کی شام میں ہر ہفتہ محاضرہ ہوتا تھا، ان سے دریافت کیا گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب مصر تشریف لائے تھے اس وقت مصر کا وہ کون سا شہر تھا جہاں ان کو بیچا گیا تھا اور پھر وہاں حکومت کے کارپرداز اور بادشاہ ہوئے، دکتور فتحی نے اپنی عدم واقفیت کا تذکرہ کیا، لیکن آئندہ ہفتے معلومات حاصل کرنے اور واقف کرانے کا وعدہ فرمایا، لہٰذا دوسرے ہفتہ انہوں نے بتایا کہ وہ شہر الاقصر ہے جو یہاں قاہرہ سے تقریباً سات سو کلو میٹر دوری پر واقع ہے، دریائے نیل کے کنارے پر یہ شہر واقع ہے اس کے دو حصے ہیں، البر الشرقی اور البر الغربی۔

البر الغربی وہ شہر ہے جہاں فراعنہ دور کے آثار مورتیاں اور بڑے بڑے معابد ہیں اور البر الشرقی میں ان کے مقابر ہیں وہاں ایک وادی بھی ہے جس کو وادی ملک کہا جاتا ہے اور وادی ملکات بھی ہے، یہ شہر بہت قدیم ہے، یہاں کے باشندوں کو حنوط میں بڑی مہارت تھی، لاشوں کو اس طرح ممی کرتے تھے کہ صدیاں گذرنے کے بعد بھی لاش اپنی اصلی حالت پر باقی رہتی تھی وہاں عجائب خانہ میں کئی ایسی لاشیں رکھی ہیں جو ممی شدہ ہیں ان کا یہ فن ایسا ترقی یافتہ تھا کہ آج تک اس کا پتہ بھی نہ چل سکا کہ وہ کس طرح ممی کرتے تھے اور اس میں کیا کیا چیزیں استعمال کرتے تھے۔

المحلة الكبرى

شعبان المعظم کے دوسرے عشرہ میں المحلۃ الکبریٰ کا پروگرام تھا، مصر کا یہ صنعتی شہر اسکندریہ اور قاہرہ کے درمیان طنطا سے قریب واقع ہے، اس علاقہ میں روئی کی کاشت بڑے پیمانے کی جاتی ہے، لہٰذا یہاں بڑی بڑی کاٹن ملیں بنائی گئی ہیں، جہاں ہر طرح کے ملبوسات تیار ہوتے ہیں، ایک ہی کیمپس میں دو سو ملیں بیک وقت کام کرتی ہیں، وہاں پہونچنے پر چیف منیجر کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا، پر تکلف دعوت کے ساتھ صنعتی یونٹوں کا سرسری معائنہ بھی کرایا گیا، یہ شہر اپنی صنعت کی وجہ سے پورے مشرق وسطیٰ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے، ماضی میں تفسیر جلالین کے مصنف علامہ جلال الدین محلی نے (جو اس سرزمین پر آسودۂ خاک ہیں) عزت بخشی تھی۔

مصر کے اسلامی آثار گزشتہ تحریروں میں فرعونی آثار کا تذکرہ آچکا ہے، لیکن مصر اسلامی آثار کے لئے بھی بہت ممتاز ہے، بڑی بڑی تاریخی مسجدیں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نیز دیگر علماء ومشائخ کے مقابر خانقاہیں اور تاریخی مساجد کے باقیات آج بھی اپنے اندر بہت کشش رکھتے ہین، خصوصاً ان اھل علم کے لئے جنہوں نے اسلاف کے خوان یغما سے زلہ ربائی کی ہے، اور چمن علم کے نور ونکہت سے مشام جاں کو معطر کرتے رہے ہیں، لہٰذا بڑی خواہش تھی کہ ان تاریخی آثار کا بچشم خود مشاہدہ کیا جائے، لیکن یہ کام بہت آسان بھی نہیں تھا۔ ہندوستانی طلباء میں اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، مولوی قمر الحسن بجنوری، مولوی محمد سعد ممبئی، مولوی عبدالسمیع ندوی، مولوی محمد مبین الدین بھوپالی کو کہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت نکالا، اور حتی الوسع ان جگہوں پر لے گئے جہاں ایک اجنبی کے لئے پہنچنا آسان نہیں تھا۔ گاہے بگاہے دیگر ندوی طلباء کی بھی مشارکت ورفاقت حاصل رہی۔

مولوی قمر الحسن بجنوری قاسمی ہندوستانی طلباء میں اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ ان کا کمرہ ہندوستانی قونصل خانہ معلوم ہوتا ہے۔ ہر ایک کا خیال رکھنا، دوسروں کے کام آنا، انتہائی منکسر المزاج اور متواضع ہیں، انہوں نے راقم الحروف کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جیسا کہ ایک مخلص شاگرد اپنے محسن ومربی استاد کے ساتھ کرتا ہے، خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے اور میرے کمرے بھیجتے، کبھی خود لے کر آتے، اکثر مولوی محمد سعد بمبئی کے ذریعہ بھیجتے، تقریباً دوماہ تک بغیر کسی کلفت کے یہ عمل جاری رہا۔ جب ان کا امتحان شروع ہوگیا تو مولوی محمد مبین الدین ندوی بھوپالی نے ازراہ محبت یہ ذمہ داری قبول کی اور افطار، کھانا اور سحری کا بڑی رغبت وشوق اور محبت سے انتظام کیا، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزائے خیر سے نوازے۔

مسجد سیدنا الحسینؓ میں حاضری

مسجد سیدنا الحسین رضی اللہ عنہ قاہرہ کی مشہور ترین اور فن تعمیر کے اعتبار سے خوبصورت ترین مسجدوں میں ہے، اس کے داہنی جانب وسیع کشادہ اور خوبصورت پارک بنے ہوئے ہیں۔ پارکوں کے بازو میں ادارۃ الازہر ہے۔ اور مرکزی شاہراہ شارع جوہر القائد ہے متصل جامع ازہر اور یونیورسٹی کی دیگر عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، مسجد سیدنا الحسینؓ کے جنوبی حصہ میں

قبلہ کی جانب مسجد کی دیوار سے لگ کر سیدنا الحسینؓ کا روضہ بھی بنا ہوا ہے، جس کا دروازہ مسجد کے اندر منبر کے داہنی جانب کھلتا ہے۔ زائرین کی بڑی تعداد برابر وہاں موجود ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں حضرت سیدنا الحسینؓ کے سر مبارک کو دمشق سے لاکر دفن کیا گیا ہے، لیکن اس سلسلہ میں کوئی تحقیقی بات نہیں کہی جاسکتی ہے، اسماعیلی اور داؤدی بوہرے فرقے کے لوگ یہاں پر بہت کثرت سے آتے ہیں۔

نکاح کے بعد شادی شدہ جوڑے ایک خاص قسم کے باجے اور دف کے ساتھ مزار پر حاضری کے لئے اور خواتین جو ہمراہ ہوتی ہیں منہ سے ایک خاص قسم کی سیٹی بجاتی ہیں جو مصر میں عام طور پر خوشی کا اظہار کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے لہٰذا مشاہد پر حاضری کے وقت خواتین عام طور ایسی آواز نکالتی ہیں، دولہا مغربی لباس میں ملبوس ہوتا ہے، اور دولہن فرانسیسی گاؤن کے طرز کا لباس جو عام طور پر سفید ہوتا ہے زیب تن کئے ہوئے ہوتی ہے، عزیز واقارب کے جلوس میں ویڈیو فلمیں بھی تیار کی جاتی ہیں، اس کے بعد دولہا دولہن مسجد سے ملحق پارک میں چلے جاتے ہیں اور وہاں پر پوز لئے جاتے ہیں، مغربی خواتین کی طرح نہ ان میں کسی قسم کی حیاء ہوتی ہے اور نہ ہی برسر عام تصویر اترواتے میں کوئی ہچکچاہٹ۔

کہا جاتا ہے کہ وہاں حضرت حسینؓ کا سر مبارک دفن ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کے تین بال مبارک ہیں۔ آپ ﷺ کے عصا کا ایک ٹکڑا اور ایک تلوار ہے۔ جس کا نام متحف ہے وہاں مصحف علی وعثمان بھی ہے۔ طبقة القدم النبوي اور جوتا بھی ہے۔ شیعہ زائرین وہاں کافی آتے ہیں۔ قاہرہ میں تھوڑے شیعہ ہیں کچھ ہندو بھی ہیں۔ شارع الازہر پر ٹرافک بہت ہوتی ہے۔ جامعہ ازہر (قدیم) قاہرہ قدیمہ میں ہے۔

مسجد عمروبن العاصؓ

مصر کی سرزمین پر سب سے قدیم مسجد حضرت عمرو بن العاصؓ ہے، یہ مسجد جو عیسائیوں کے تاریخی کنیسہ، ماری گرگیس جسے "الكنيسة المعلقة" کہا جاتا ہے، کے بازو میں تھوڑے فاصلے پر مشرقی سمت نشیبی حصہ میں واقع ہے جہاں اس زمانہ میں انگور کی کاشت کی جاتی تھی۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے جس حصہ میں مسجد تعمیر کی تھی وہ حصہ آج بھی مسجد کے وسیع صحن میں اک قبہ کے زیر سایہ موجود ہے، بعد کے ادوار میں اس میں توسیع کا سلسلہ جاری رہا، ماضی میں اس مسجد کا استعمال مجلس قضاء کے لئے ہوتا تھا اور وسیع حلقہائے درس بھی ہوتے تھے۔ علامہ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں لکھا ہے کہ رات کے وقت اس مسجد میں اٹھارہ ہزار چراغ روشن کئے جاتے تھے، اس سے مسجد کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے آج بھی یہ مسجد فسطاط کی سب سے بڑی مسجد ہے، بلکہ قاہرہ میں اس کی نظیر نہیں، اسی مسجد کے مشرقی جنوبی گوشہ پر صحابی جلیل القدر عبداللہ بن عمروؓ کا مزار ہے۔

جمعہ کی نماز کے بعد مزار پر بھی حاضری ہوئی اور شرف سلام کی بھی سعادت نصیب ہوئی، اس وقت اس احساس سے ایک جھرجھری سی طاری ہوگئی کہ یہی وہ صحابی جلیل ہیں جنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور سنت کو ایک طبعی افتاد کے طور پر قبول کیا تھا جو علمی ونظری دائرے سے گذر کر عقلی افق سے ماوراء فکر و ذہن اور نگاہ و دل کا خلاصہ اور سرمایہ ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عہد کیا تھا زندگی بھر اس پر قائم رہے اور راضی بہ رضا اس عالم فانی سے رخصت ہوئے جنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کا مجموعہ ''صادقہ'' کے نام سے مرتب کیا تھا، لہٰذا تدوین حدیث میں تاریخی طور پر صادقہ کا بہت اونچا مقام ہے۔

مسجد کا اندرونی مسقف حصہ طویل ستونوں پر قائم ہے، چھت کرم خوردہ ہوگئی تھی، لہٰذا اس کی مرمت کا کام چند سالوں سے چل رہا ہے، مصر کے صدر حسنی مبارک کی خصوصی توجہ کی وجہ سے اس وقت یہ کام تیزی سے ہو رہا ہے اور کئی تاریخی مساجد کی ترمیم اور تزئین صدر حسنی مبارک کا ایک اہم کارنامہ ہے، جس میں جامع ازہر بھی شامل ہے، ابھی حال میں مسجد سیدہ زینبؓ کی توسیع کروڑوں روپے صرف کر کے کی گئی ہے۔

جامع عمرو بن العاصؓ میں بیک وقت بیس پچیس ہزار سے زیادہ نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں مصر کے مشہور قاری جناب قاری جبرائیل صاحب تراویح میں قرآن پاک پڑھتے ہیں تو پوری مسجد کھچا کھچ بھری ہوتی ہے۔ ''اذاعۃ القرآن الکریم'' ریڈیو پر پورا پروگرام اہتمام سے پیش کیا جاتا ہے۔

مسجد سلطان حسن

قلعہ محمد علی کے دامن میں واقع پانچ تاریخی مسجدوں میں سے مسجد سلطان حسن فن تعمیر کا ایک عجوبہ ہے، مسجد السید رفاعی کے بازو میں واقع ہے، اس مسجد کی تعمیر والی مصر سلطان حسن نے کی، جو عہد ممالیک کا طاقتور، انصاف پسند اور دیندار بادشاہ سمجھا جاتا ہے، اس مسجد کا صدر گیٹ بہت بلند ہے، بیل بوٹے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ آج بھی امتداد زمانہ کے باوجود اس کے حسن کی تنویر سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، اس کی چھت کی اونچائی تقریباً اسّی فٹ ہے، مکمل ۱۰۰ رزینے طے کرنے کے بعد چھت تک پہنچا جا سکتا ہے، مسجد کے صحن کے بیچ میں حوض بنا ہوا ہے جو خشک پڑا ہوا ہے، اس پر ایک چھوٹی سی عمارت ہے جس میں وضو کے لئے ٹونٹیاں لگا دی گئی ہیں، اس میں چار دالان ہیں جہاں چاروں ائمہ کے مصلے قائم تھے اور ہر مصلے کے ساتھ مدرسہ بھی بنایا گیا تھا اور ہر مدرسہ کے صدر گیٹ پر آج بھی جلی حروف سے ''المدرسۃ الحنفیۃ الشافعیۃ'' وغیرہ لکھا ہوا ہے، ہم ''المدرسۃ الحنفیۃ'' کے صدر گیٹ پر جب پہنچے تو دل میں یہ آرزو انگڑائی لینے لگی کہ کاش اندر بھی داخل ہوا جاتا، امام مسجد کے اشارہ پر بواب نے دروازہ کھول دیا، اندر داخل ہوئے گرد غبار سے اٹی ہوئی راہداریاں، کمرے اور زینوں سے چھت پر پہنچے تقریباً ہر مدرسہ میں اسی طرز کی راہداریاں اور کمرے بنے ہوئے ہیں، کبھی یہ کمرے علماء اساتذہ اور طلباء کا مسکن تھے، آج گرد سے اٹے ہوئے کسی خزاں دیدہ چمن کے پت جھڑ کا منظر پیش کرتے ہیں۔

اس کا مرکزی منارہ کافی اونچا ہے، کوشش کے باوجود اس کی بلندی تک پہونچنا آسان نہ تھا، لہٰذا تھوڑی دیر زینوں کی اٹی ہوئی راہداریوں کا غازہ پلکوں پر سجاتے ہوئے واپس آ گئے۔

مسجد احمد بن طولون

مسجد سلطان حسن سے تقریباً دو فرلانگ پر واقع قاہرہ کے محلّہ قطائع کے فرازوں پر تیسری صدی ہجری کی تعمیر شدہ سب سے عظیم مسجد ہے، فسطاط کے بعد تیسری صدی ہجری میں القطائع کو مرکزیت حاصل ہوئی، جسے احمد بن طولون نے اپنا مستقر بنا لیا تھا، احمد بن طولون طولونی خاندان کا

بانی اور مصر کا پہلا مسلمان والی ہے، جس نے مصر سے شام کا الحاق کیا، وہ عباسی خلفاء کا برائے نام باجگذار تھا، بڑاذ کی ہوشیار صاحب فراست بادشاہ تھا، اس کی وفات ذوالقعدہ ۲۷۰ھ مارچ ۸۸۴ء میں ہوئی، اس کے زمانہ میں مصر میں بڑی خوشحالی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ مصر سے دارالخلافہ بغداد کو کسی قسم کا خراج نہیں بھیجا جاتا تھا، سب کچھ وہیں خرچ کیا جاتا تھا، یہ مسجد اپنی وسعت میں بھوپال کی تاج المساجد سے بڑھی ہوئی ہے، اس مسجد کے گرد سنگی فصیل بنی ہوئی ہے، ان فصیلوں کے آس پاس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کوڑا ڈالتے تھے، لیکن اب حکومت مصر نے کچھ صفائی کا اہتمام کیا ہے۔

سیاحوں کی آمد و رفت یہاں بھی رہتی ہے، اس مسجد کو دیکھنے کے لیے دس پونڈ مصری خرچ کرنے پڑتے ہیں، ہم لوگ جمعہ کے دن نماز کی ادائیگی کے لئے گئے، مسجد کی تعمیر سنگ رمادی سے ہوئی ہے، امتداد زمانہ کے باوجود مسجد ابھی اچھی حالت میں ہے، البتہ پتھروں پر کالک سی جمی ہوئی ہے، جس سے اس کی قدامت کا اظہار ہوتا ہے، مسجد کا صحن بہت کشادہ ہے، صحن میں تقریباً پانچ ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے، لیکن فرش پر پتھروں کی گٹیاں پڑی ہوئی ہیں، درمیان میں وضوخانہ ہے، جس پر بلند و بالا و خوبصورت گنبد بنا ہوا ہے، شمالی حصہ میں مئذنہ ہے جو اپنے طرز تعمیر میں منفرد ہے، مسجد قلب شہر میں واقع ہے، آس پاس چھوٹی چھوٹی اور مسجدیں بھی ہیں، لیکن جمعہ کی نماز میں بھی اس کا مسقف حصہ نہ بھر سکا مسجد کے ایک حصہ میں بہت معمولی فرش بچھا ہوا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس مسجد کی طرف اہل محلہ کی توجہ نہیں ہے، اور حکومت بھی آثار قدیمہ کے طور پر نگرانی کر رہی ہے، جمعہ کی نماز ایک نوجوان کلین شیپ نے پڑھائی، خطبہ سے معلوم ہوتا تھا کہ علمی استعداد کمزور ہے، یہاں پہلا موقع تھا جب جمعہ کی نماز کسی ایسے امام کے پیچھے ادا کی گئی جس کی داڑھی مونڈی ہوئی تھی، ورنہ مسجد عمرو بن العاصؓ، جامع ازہر، مسجد الحسینؓ، اور مسجد سیدنا زینبؓ، مسجد عائشہؓ، مسجد سیدہ نفیسہ، مسجد سید رفاعی، جو مصر کی تاریخی قدیم مساجد میں ہیں ہر جگہ امام باریش ہی تھے، جس سے بڑی خوشی ہوتی تھی اور مصر کے بارے میں عام خیال کی تغلیط بھی ہو جاتی تھی، نماز کے بعد امام صاحب سے مسجد کے بارے میں کچھ سوالات کئے لیکن جواب دینے کے بجائے خاموشی سے وہ

باہر نکل گئے، مسجد کے مشرقی گوشہ میں قبلہ کی جانب طولونی عہد کا میوزیم بھی ہے، اس کی عمارت بھی فصیل کے اندر ہے، اس میں اس عہد کی بعض نادر و نایاب چیزیں موجود ہیں لیکن وقت کی کمی اور ٹکٹ کی گرانی کی وجہ سے اندر جانے کی ہمت نہ ہوسکی، اس مسجد کے شمال مشرقی گوشہ میں مدرسہ احمد بن طولون کی عظیم عمارت ہے جو آج بھی قائم ہے۔

مسجد علامہ عینیؒ اور علامہ قسطلانیؒ کے حضور میں

جامعہ ازہر کے مغربی گیٹ سے پچاس گز کے فاصلے پر علامہ عینیؒ شارح بخاری کی مسجد ہے، علامہ عینیؒ نے اس مسجد کی تعمیر کے بعد درس وافادہ کا سلسلہ اس مسجد میں جاری کیا تھا، اس مسجد سے ملحق مغربی سمت میں دو منزلہ عمارت طلباء کی رہائش گاہ کے لئے بنائی گئی تھی، مسجد بہت چھوٹی سی ہے، مشکل سے ایک صف میں آٹھ یا دس مصلی کھڑے ہو سکتے ہیں، پوری مسجد میں پچاس مصلیوں کی گنجائش ہوسکتی ہے، جمعہ کی نماز اس میں بھی ہوتی ہے، اس مسجد اور طلباء کے دارالاقامہ کے درمیان دو ہال بنے ہوئے ہیں، یہی وہ جگہ تھی جہاں علامہ عینیؒ درس دیا کرتے تھے اور قبلہ کی جانب نسبتاً جو بڑا ہال ہے، اس ہال میں علامہ قسطلانیؒ کا درس ہوتا تھا، مسجد کے امام صاحب سے مغرب کی نماز میں ملاقات ہوئی، ازہری اور اچھے قاری ہیں، بڑے متین اور سنجیدہ معلوم ہوئے، جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم ہندوستان سے آئے ہیں بہت خوش ہوئے اور اپنے کمرے میں لئے گئے اس وقت علامہ عینیؒ پر کچھ کام کر رہے تھے، مسودات کے بعض حصے خود پڑھ کر سنائے، انہوں نے دو قدیم حوض بھی دکھایا جو طلباء اور مصلیوں کی سہولت کے لئے بنایا گیا تھا۔

علامہ عینیؒ نے اس مسجد کو اس لیے تعمیر کیا تھا کہ ان کے خیال میں الجامع الازہر میں نماز ان کے نزدیک صحیح نہیں تھی، اس لئے کہ اس وقت ازہر کی مسجد کا متولی کوئی رافضی تھا، لہٰذا علامہ عینیؒ فرمایا کرتے تھے جو سبّ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا مرتکب ہو اس کی زیر تولیت مسجد میں نماز نہیں پڑھی جاسکتی، یہ دراصل علامہؒ کی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے غایت درجہ عقیدت اور محبت کی دلیل ہے، ورنہ خود جامع ازہر کی تعمیر فاطمی خلیفہ المعز لدین اللہ نے کرائی ہے اور وہ کوئی سنی خلیفہ نہ تھا، لیکن بعد کے ادوار میں بڑے علماء اور مشائخ نہ صرف ازہر میں تعلیم حاصل کرتے

اور درس وتدریس میں مصروف رہے بلکہ اسی مسجد میں نماز بھی ادا کرتے رہے ہیں۔

علامہ عینیؒ اور علامہ قسطلانیؒ دونوں عظیم المرتبت عالم اور محدث اور شارح بخاری ہیں، عمدۃ القاری اور ارشاد الساری بالترتیب شروحات بخاری میں اہمیت کی حامل ہے، یہی وہ جگہ ہے جہاں ان شروحات کی تسوید وتبیض کا کام ہوا، وہیں ان دونوں بزرگوں کا مزار بھی ایک ہی ساتھ ہے، قبر پر حاضری ہوئی سلام کرنے اور فاتحہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، علامہ عینیؒ کے مزار کے بازو میں ایک اور کمرہ بنا ہوا ہے جہاں آپ کی اہلیہ اور دیگر افراد خانہ کی قبریں ہیں۔

مسجد الامام الشافعیؒ

جبل مقطّم ڈھلوان پر مصر کے قدیم قبرستانوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے دنیا میں قبرستانوں کا اتنا طویل سلسلہ شاید ہی کہیں موجود ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر خاندان کا قبرستان الگ الگ فصیل بند سنگ رمادی سے تعمیر شدہ ہوتا ہے۔ داخلی دروازہ کے بازو میں ایک یا دو کمرے بھی بنے ہوتے ہیں، اندر صحن میں قبریں ہوتی ہیں، جو عام طور پر کچی ہوتی ہیں، ان کمروں میں غریب اور کمزور طبقے کے لوگ آباد بھی ہو جاتے ہیں، اس طرح قبرستانوں کے ساتھ ساتھ آبادی کا بھی سلسلہ قائم ہے، پوری پوری فیملی قبرستانوں میں رہتی ہے انہیں کوئی وحشت محسوس نہیں ہوتی، حالانکہ پانی اور راشن کا مسئلہ دشوار ہے ہر جگہ یہ سہولت نہیں ہے، امام شافعیؒ کا مزار بھی اسی طویل شہر خموشاں مگر شہر آباد کے ایک مرکزی مقام پر جسے قرافہ کہا جاتا ہے موجود ہے، یہ قاہرہ کا قدیم علاقہ ہے، اس علاقہ میں مشہور ائمہ اور مشائخ بلکہ بعض صحابہ کرامؓ بھی مدفون ہیں، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جاتے ہوئے شارع صلاح سالم کے موڑ پر دو تاریخی میناروں کے درمیان قلعہ محمد علی کے ڈھلوان پر علامہ سیوطیؒ کا مزار واقع ہے، وہاں بھی حاضری ہوئی، لیکن بواب کی عدم موجودگی کہ وجہ سے اندر داخل نہ ہو سکے، سلام کرنے اور ایصال ثواب کے بعد شارع الامام الشافعی رحمۃ اللہ علیہ پر آ گئے، مولوی عزیر احمد صاحب ندوی نے بتایا کہ اسی سڑک پر آگے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد حضرت امام وکیع رحمۃ اللہ کی قبر ہے۔ ان علاقوں کو دیکھنے کے لیے کرایہ پر ٹیکسی کر لی گئی تھی، مولوی عزیر احمد ندوی صاحب کی رفاقت میں ان مشاہد کی زیارت کا پروگرام طے ہوا تھا۔

لہٰذا سڑک کے داہنی طرف ایک چھوٹے سے کمرے کے پاس انہوں نے گاڑی رکوادی سامنے ایک چھوٹی سی قبر نظر آرہی تھی جس پر سبز رنگ کی ایک بوسیدہ چادر پڑی ہوئی تھی وہاں ایک کتبہ لگا ہوا تھا جس پر سیدنا الامام وکیع کندہ تھا، حضرت امام شافعیؒ کو امام وکیع سے بڑا گہرا تعلق تھا، انہوں نے ایک مرتبہ پر اپنے استاد جلیل سے اپنے سوء حافظہ کا تذکرہ کیا، اس وقت حضرت امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ نے جو وصیت فرمائی تھی اس کا تذکرہ امام شافعی رحمۃ اللہ بڑے اچھوتے انداز میں اپنے اشعار میں یوں کرتے ہیں۔

شکوت إلی وکیع سوء حفظی
فاوصانی إلی ترک المعاصی
فان العلم نور من الهی
ونورالله لا یعطی لعاصی

میں نے (اپنے استاد) امام وکیعؒ کی خدمت میں اپنے سوء حافظہ کا تذکرہ کیا تو استاد محترم نے مجھے معصیت سے گریز کرنے کی تاکید کی اور فرمایا کہ علم نور الٰہی کا مظہر ہے اس نور کی برکتیں نافرمان کو نہیں حاصل ہوسکتیں۔

قبر کے سامنے آئے تو تھوڑی دیر تصورات کی دنیا میں کھو گئے، استاد کی خدمت میں سلام گذار کر تلمیذ خاص امام زماں حضرت امام شافعیؒ کی خدمت میں کشاں کشاں چند گام ہی آگے بڑھے تھے کہ مولوی عزیر صاحب نے بتایا کہ یہ بائیں طرف شارع الامام الطحاوی ہے گاڑی سڑک کے نکڑ پر روک دی گئی، مولوی محمد عزیر صاحب نے حضرت امام طحاویؒ کے مزار کی تلاش میں بعض راہگیروں سے استفسار بھی کیا، ایک مکان کے قریب جا کر مزید معلومات بھی کرنی چاہی لیکن ناکامی رہی، حضرت امام طحاویؒ کے مزار کی نشاندہی نہیں ہوسکی، افسوس کے ساتھ ہم لوگ آگے بڑھے اور تھوڑی دیر میں امام شافعیؒ کے قرافہ میں حاضر تھے، سامنے خوبصورت رمادی پتھروں کی بنی ہوئی مسجد تھی، مسجد کے سامنے کھلا ہوا صحن تھا، قبلہ کی طرف جنوبی گوشہ میں اس مدرسہ کی دو منزلہ وسیع اور خوبصورت عمارت تھی جس میں کبھی حضرت امام شافعیؒ کا درس ہوا کرتا تھا، آج

وہ پوری عمارت کسی دریدہ پیرہن گلیم پوش بوڑھی خاتون (جو اولاد نرینہ سے محروم بیوگی کی افتاد سے دوچار ہو) منظر پیش کر رہی تھی۔

چشم پر نم زلف آشفتہ نگاہیں بے قرار
اس پشیمانی کے صدقے میں پشیماں ہو گیا

مسجد کے اندر داخل ہونے کے بجائے قبلہ کی دیوار سے لگ کر بنے ہوئے اس بلند دروازے تک پہونچ گئے جہاں سے امام شافعیؒ کے مزار پر حاضری ہوتی ہے، خوبصورت گنبد کے زیر سایہ امام شافعیؒ کے مزار کے ساتھ چند اور بھی مزارات ہیں، جہاں مزار بنا ہوا ہے وہ وہی جگہ ہے جہاں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بغداد سے واپسی پر قیام پذیر ہوئے تھے، وہ مصر کے ایک رئیس کا مکان تھا جنہیں حضرت امام شافعیؒ سے غایت درجہ محبت تھی، اسی جگہ حضرت امام شافعیؒ نے اپنے فقہی آراء کی تجدید کی، اصول فقہ کی معرکۃ الآراء کتاب الرسالہ کی تنقیح کا کام ممکن ہوا اور نہ جانے علم حدیث وسنت کے کیسے کیسے سوتے پھوٹے جن سے تشنہ کامان ہدایت صدیوں سے سیراب ہوتے رہے ہیں، مسجد الامام الشافعیؒ کے امام سے بھی ملاقات ہوئی، وہ بڑے خلیق مرنجاں مرنج صاحب علم اور سادے طبیعت کے تھے، بہت خوش ہوئے اور اپنے خاص کمرے سے آکر دوبارہ مزار کے پاس لے گئے اور اندر بنی ہوئی قبروں کی نشاندہی فرمائی اور پھر مغربی دیوار کے قریب جاکر فرش پر بچھی ہوئی قالین ہٹا کر اس پتھر کو دکھایا جس کا رنگ دیگر پتھروں سے مختلف تھا، وہ ایک فٹ مربع پتھر ابلقی کلر کا تھا، اس پر قدم کا نشان تھا امام صاحب نے فرمایا کہ یہ وہ پتھر ہے جس پر نقش پائے رسول موجود ہے، اس پر ہاتھ لگانے سے ایک خاص قسم کی خوشبو محسوس ہوتی ہے، فرط عقیدت میں میرے ہاتھ بڑھ گئے لیکن اپنی عملی کمزوریاں نکہت پائے رسول کے عطر بیز جھونکوں سے سرفرازی کی راہ میں حائل ہوتی ہوئی نظر آئیں۔

امام صاحب اس تاریخی پتھر کی کوئی تاریخ نہ بتا سکے، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے سرہانے ایک آٹھ فٹ لمبا خوبصورت سنگ مرمر کا ستون لگا ہوا ہے، جس پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ووفات کندہ ہے، زائرین میں بعض اس ستون سے بھی برکت حاصل

کرتے ہیں، مزار کے چاروں طرف خوبصورت لکڑی کی بنی ہوئی جالی ہے، سبز رنگ کی مزرکش چادر قبر پر پڑی ہوئی ہے، سرہانے کی جانب قرآن پاک کا ایک بڑا نسخہ کھلا ہوا رکھا ہے، سلام عرض کرنے کے بعد تھوڑی دیر رک کر ایصال ثواب کے بعد واپسی ہوئی۔

مزار کے دروازہ کے بائیں جانب ایک چھوٹی سی اونچی قبر ہے جو مسجد کی دیوار سے لگی ہوئی ہے امام صاحب نے بتایا کہ یہ قبر شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ کی ہے جو اس کے خطیب تھے اور جن کی بہت سی کتابیں برصغیر میں متداول ہیں۔

جمعہ کا خطبہ

برصغیر کے برعکس مصر میں عام طور پر خطبوں کے انداز سے حالات اور تقاضے نیز پیش آمدہ احوال کی عکاسی ہوتی ہے، خطیب خوب کھل کر گفتگو کرتا ہے البتہ (شجر ممنوعہ) داخلی سیاست اس کی زبان کی گرفت سے آزاد ہوتی ہے، خیال یہ تھا کہ اسرائیل کے تعلق سے وہاں رویہ یہی ہوگا لیکن جامع عمرو بن العاصؓ کے خطیب نے اس کے برعکس اسرائیل کے خلاف جارحانہ انداز میں گفتگو کی اور ''ابناء القردو الخنازیر'' کہا، معلوم ہوا کہ اس وقت مصر کی سیاست انور السادات کی سیاست اسرائیل کے تعلق سے بہت مختلف ہے۔

ماری گرگیس

جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر مولوی قمر الحسن اور مولوی محمد سعد کی رفاقت میں وہ تاریخی چرچ دیکھنے گئے جسے ''الکنیسة المعلقة'' کہا جاتا ہے جو اسلام سے پہلے قبطی عیسائیوں کا دینی اور سیاسی مرکز تھا، شاہ مصر مقوقس بعض روایات کے مطابق وہیں پناہ گزیں ہوا تھا، لیکن اس کے سقوط کے ساتھ ہی پورا مصر اسلام کے زیر سایہ آ گیا، مسلمانوں نے اس تاریخی چرچ کو باقی رکھا، بلکہ اس کے تمسکات پر بھی ہاتھ نہ ڈالا۔ آج مسلمانوں کے عدل و مساوات کے اس کے در و بام شاہد ہیں، چرچ ایک بڑے احاطہ کے شمالی گوشہ میں اونچے ستونوں پر قائم ہے، تیس پینتیس زینے چڑھنے کے بعد چرچ میں داخل ہوا جا سکتا ہے، صدر گیٹ پر چوکیدار سے جب اجازت چاہی گئی تو بہت خوشی کے ساتھ اہلاً وسہلاً کہتے ہوئے اندر جانے کی اجازت دیدی پاکستانیوں کے مقابلہ میں

ہندوستانیوں کے ساتھ اہل مصر کا معاملہ بہتر ہے، خصوصاً ان تاریخی چرچوں میں پاکستانیوں پر بڑی کڑی نظر رکھی جاتی ہے، چرچ کے نچلے حصہ میں اب بھی پانی موجود تھا، ہوسکتا ہے پہلے وہ پانی صاف وشفاف ہو لیکن اب تو تعفن خیز محسوس ہوتا ہے، چرچ میں ہم داخل ہوئے تو ایک مصری عیسائی نے رہنمائی کی اندر بے شمار ایک میز پر موم بتیاں جل رہی تھیں، خواتین کی ایک جماعت دیوار پر بنی مبہم تصویر کی آرتی اتار رہی تھیں، شاید اسی طرح وہ اپنی نذر پوری کر رہی تھیں، رہبر نے بڑے لطیف انداز میں ہم لوگوں کو بھی دعوت دی، لیکن ایک محسوس ناگواری کے احساس نے اسے اپنی غلطی کا احساس دلایا اور اس نے گفتگو کا رخ بدل کر دیگر چیزوں کی نشاندہی کی طرف موڑ دی، چرچ کے اندر فضا کسی قدر مندر کی فضا کی طرح تھی اور محسوس ہو رہا تھا کہ کسی مغلوب قوم کے معبد میں ہم موجود ہیں، سامنے کی دیواروں پر بڑی حسین روغنی تصویریں بنی ہوئی تھیں، اس میں ایک تصویر بے انتہا خوبصورت تھی، معلوم ہوا کہ فرشتوں کے سردار حضرت میکائیل کی تصویر ہے، اس عبادت گاہ کے ایک حصہ میں معافی گھر بھی موجود ہے جہاں مجرمین اپنے آپ کو ایک قدیم آہنی زنجیر میں کس کر معافی کے طالب ہوتے ہیں اور پادری کی جانب سے پروانۂ معافی مل جاتا ہے۔

اسی حصہ میں آلات تعذیب بھی آج تک رکھے ہوئے ہیں۔ جن سے اہل روم اپنے ہم مذہب اہل مصر کو سزا دیا کرتے تھے، ماری گریس قبطی عیسائیوں کا سردار تھا، اس کو جس طرح تڑپا تڑپا کر اہل روم نے قتل کیا ہے اس کی ترجمانی تصویروں کی زبانی کی گئی ہے جو بڑا دلدوز منظر ہے، اسلام کے سایۂ عاطفت میں اہل مصر کو عدل ومساوات کی دولت ملی، یہی وجہ ہے کہ قبطی مصریوں کا غالب حصہ چند صدیوں میں حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔

شادیاں

مصر میں شادیاں جہیز کے بغیر ہوتی ہے، لیکن پھر بھی شادی کرنا آسان نہیں ہے، شادی سے پہلے دولہا کے لئے لازم ہے کہ دلہن کے لئے ایک الگ رہائش کا نظم کرے اور مہر کی رقم ادا کرنے کا عام رواج ہے، اس لیے عام طور پر نوجوان پریشان رہتے ہیں اور لڑکیاں بن بیاہی بیٹھی رہ جاتی ہیں، نتیجتاً بے راہ روی فحاشی اور بدکاریاں انہیں چور دروازوں سے راہ پاتی ہیں۔ سیدنا

الحسینؓ کے مزار کے داہنی جانب ملحق کمرہ میں ایک اور مزار ہے، جس کے بارے میں یہ بتایا گیا کہ وہ ان صاحب کا مزار ہے، جنہوں نے حضرت حسینؓ کے سر مبارک کو دمشق سے مصر لانے کی خدمت انجام دی ہے۔

قاہرہ میں الحسینؓ ایک مرکزی بازار بھی ہے، جس کے جلو میں خان خلیلی کی مشہور ترین تنگ مگر نفیس گلیاں ہیں، جن میں ہر طرح کا سامان ملتا ہے۔ مصر کا یہ بہت قدیم اور مشہور بازار ہے۔ عام طور پر سیاحوں کی اس میں کثرت ہوتی ہے، قیمتی ہیرے جواہرات کے علاوہ مشہور ترین عطورات کا کاروبار بھی یہاں ہوتا ہے، خان خلیلی کا شمالی حصہ میں جس کا اختتام ایک وسیع شاہراہ پر ہوتا ہے، عطاروں کی دوکانیں بہت سی نظر آئیں جہاں یونانی ادویات کے مفردات وافر مقدار میں ملتے رہیں، لیکن کوئی حکیم نظر نہیں آیا اور نہ ہی کسی حکیم کے بورڈ پر نظر پڑی۔ لیکن اس کے باوجود بڑی بڑی دکانوں کا پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ یونانی علاج ومعالجہ کا کاروبار ضرور جاری ہے پھر ان مفردات کو بیرون ملک ایکسپورٹ کیا جاتا ہوگا۔

مسجد الحسینؓ کو دینی حیثیت سے ایک مرکزیت حاصل ہے، رمضان المبارک کے زمانہ میں وزارت اوقاف کی طرف سے ملتقی الفکر الاسلامی کے عنوان سے دینی اسلامی اور فکری پروگرام مسجد سے ملحق پارک میں لگے شامیانے میں ہوتے ہیں، جو تقریباً آخری عشرہ تک جاری رہتے ہیں مصر کے بڑے بڑے علماء، فضلا، خطباء، مفکرین اور دانشور خطاب کرتے ہیں، مسجد کے زیر سایہ کچھ اور بھی شامیانے لگے ہوتے ہیں جن میں طریقہ شاذلیہ تیجانیہ اور دیگر سلاسل کے رسوم ورواج کے مطابق اجتماعی کھڑے ہوئے اور بیٹھ کر وظائف کا سلسلہ جاری رہتا ہے، خصوصاً جمعرات کی شام میں یہاں بڑی چہل پہل رہتی ہے، مسجد سیدنا الحسینؓ کا اندرونی منظر جاذب نظر اور دلکش ہے، چھت کافی اونچی ہے، سنگ مرمر کے سرو قد طویل ستونوں کا سلسلہ بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے، مسجد کے اندرونی حصہ میں نفیس قالین بچھی ہوئی ہے، اس مسجد کی تزئین اور تحسین میں بوہرہ فرقے کے لوگوں کا بڑا حصہ ہے، قدیم مساجد میں اس سے زیادہ صاف ستھری خوبصورت زرق، برق، کوئی اور مسجد نظر نہیں آتی۔

امام لیث بن سعدؒ کے مزار پر

حضرت امام شافعیؒ کی زیارت کے بعد آبروئے مصر، فقیہ ومجتہد، صاحب مذہب حضرت امام لیث بن سعدؒ کے مزار پر جاتے ہوئے کہیں خام اور کہیں نیم پختہ غیر ہموار تنگ گلیوں سے گذرنا ہوا، یہ پورا علاقہ مصر قدیم کا حصہ ہے، قدامت اس کے ذروں میں تحلیل ہو کر عمارتوں پر سیاہ نقاب ڈالے ہوئے ہے، بعض خواتین کو سیاہ دستانے پہنے بھی دیکھا گیا، مصر کے تعلق سے یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی تھی، اس لیے کہ ذرائع ابلاغ نے مصر کی جو تصویر پیش کی تھی وہ بالکل مختلف تھی، جس کا مشاہدہ وہاں پر ہو رہا تھا، گلیوں سے گزرتے ہوئے امام لیث بن سعدؒ کے مزار کے سامنے پہونچے، مزار کے پیشیں حصہ میں مسجد ہے، اندر کے حصہ میں مزار بنا ہوا ہے، بعض اہل خاندان کا بھی مزار موجود ہے، مسجد قدیم طرز کی ہے، جس کی چھت لکڑی کی ہے، مسجد میں سرخ قالین بچھی ہوئی تھی، امام لیث بن سعدؒ کی مسجد کے ایک مصلی سے جب استفسار کیا کہ آخر امام لیث بن سعدؒ کا مذہب مصر میں کیوں نہیں فروغ پا سکا، تو اس نے وہی بات دہرائی جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔ ''کان افقہ من مالک ولکن اصحابہ اضاعوہ''۔

امام لیث بن سعدؒ حضرت امام مالکؒ سے بھی فقیہانہ بصیرت میں فائق تھے لیکن ان کے تلامذہ نے انہیں ضائع کر دیا۔

قرافہ عقبہ بن عامرؓ

یہاں سے آگے بڑھے تو قرافہ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ صحابی جلیل کے مرقد مبارک پر حاضری ہوئی، اس علاقہ کے چپے چپے پر قبریں بنی ہوئی ہیں، عقبہ بن عامرؓ کے احاطہ میں چھوٹی سی قدیم مسجد ہے، اندر داخل ہوئے، مسجد کے مؤذن ریڈیو کے ذریعہ قرآن پاک کی تلاوت سماعت کر رہے تھے، سلام ومصافحہ کے بعد اپنا تعارف کرایا تو بہت خوش ہوئے اور فضل کہتے ہوئے اس حصہ کی طرف لے چلے جہاں حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ مدفون ہیں، قبر پختہ بنی ہوئی تھی، البتہ حضرت عمرو بن العاصؓ کی قبر مسطح ابھری ہوئی نہیں تھی، یہی وہ عقبہ بن عامرؓ ہیں جن سے ''طی الارض'' کی کرامت کا ظہور ہوا، اور مدینہ منورہ سے شام کا سفر

صرف دو روز میں پا پیادہ کیا مصر کے گورنر بھی ہوئے، اور اسی زمین میں آسودہ خاک بھی ہوئے، حضرت عقبہ بن عامرؓ کی قبر مسجد سے قریب ہے، کسی گوشہ میں حضرت علامہ ابن حجرؒ صاحب فتح الباری شارح صحیح البخاری کا بھی مزار ہے لیکن تعین نہ ہوسکی، حضرت عقبہ بن عامرؓ کے احاطہ سے باہر تھوڑی سی آبادی بھی ہے جو معاشی اعتبار سے کمزور اور تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہے، یہاں صفائی ستھرائی کا نظام بالکل نہیں ہے، کاش اس علاقہ کو حکومت اپنی توجہ کا مرکز بناتی، احاطہ کے باہر بائیں جانب حضرت رابعہ عدویہؒ، حضرت ذوالنون مصریؒ، حضرت محمد بن الحنفیہؒ اور دیگر اکابر کی قبریں ایک ہی گنبد کے زیر سایہ ہیں، عمارت ابھی چند سال پہلے کسی عقیدت مند نے بنوائی ہے، قبروں پر چادریں پڑی ہوئی ہیں، البتہ حضرت رابعہ عدویہؒ کے مزار پر صنف نازک کا خیال کرتے ہوئے بجائے چادر کے عمدہ قسم کی مرصع اوڑھنی پڑی ہوئی ہے، قبر نسبتاً بہت زیادہ اونچی بنی ہوئی ہے، وہاں بھی سلام کا شرف حاصل ہوا، اور ایصال ثواب کی سعادت ملی۔

ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ کی آرام گاہ پر

مولوی محمد عزیر صاحب کی رہبری میں تھوڑی دور آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ آگے الامام الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ کی تعمیر کردہ شاندار مسجد ہے اور اس کے بازو میں حضرت شاہ عطاء اللہ اسکندری کا مزار واقع ہے، اس مزار کے بائیں جانب فضیلۃ الدکتور الامام الاکبر عبدالحلیم محمود سابق شیخ الازہر کی قبر ہے، موصوف نے اپنی زندگی ہی میں یہ جگہ متعین فرمادی تھی، پوری مسجد اپنی جیب خاص سے بنوائی ہے بہت خوبصورت اور وسیع مسجد ہے، ہر سال قرآن پاک رمضان المبارک میں اہتمام سے تراویح میں مکمل کیا جاتا ہے، مصر میں ڈاکٹر صاحب کو رجل صوفی کہا جاتا ہے، تصوف پر ان کی کئی کتابیں ہیں، حضرت شاہ عطاء اللہ اسکندریؒ سے بہت متاثر تھے، لہٰذا آخری آرام گاہ کے لئے انہیں کے جوار کو پسند فرمایا، موصوف کی قبر پر حاضری ہوئی تو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن کا وہ سماں سامنے آگیا جس میں الامام الاکبر مرحوم کی صدارت میں پروگرام ہوئے تھے، عرب وعجم کے مشاہیر نے شرکت کی تھی، الامام الاکبر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود ایک اونچی کرسی پر جلوہ افروز تھے، اور آپ کے بازو میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی

دامت برکاتہم رونق افروز تھے، ایک عجیب علمی فکری اور روحانی سماں تھا، جس سے بہتر منظر آج تک نظروں نے نہیں دیکھا، شیخ الازہر نے اس وقت اپنے خطبہ صدارت کی ابتدا کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ آج عالم اسلام ندوۃ العلماء کی قابل تحسین وآفریں مساعی کا احساس رکھتا ہے، اور نشر واشاعت کی ان کوششوں اور خدمت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو یہاں انجام دی جارہی ہے، ان علماء کے کام اور مقام کا بھی اس کو احساس ہے جو غور وفکر میں مشغول ہیں اور راہ خدا میں ہر طرح کوشش کررہے ہیں آپ نے یہ بھی فرمایا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ندوۃ العلماء کو آغاز ہی سے اس کے پروگرام اور مقاصد میں اس کی جدوجہد اور مساعی میں برکت وتوفیق عطا فرمائی ہے، اور اس کو ان حیرت انگیز نتائج پر پہونچایا ہے، اس نے ہر میدان میں ممتاز اور بے نظیر شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ اس نے محدثین پیدا کئے، فقہاء بھی اس کی درسگاہ سے تیار ہوکر نکلے۔ کتاب اللہ کے عالم اور مفسر بھی یہاں تیار ہوئے۔ غرض علوم اسلامیہ کے ہر شعبہ میں یہ ادارہ برگ وبار لایا۔''

چشم پرنم کے ساتھ سلام وعقیدت کا نذرانہ پیش کیا۔ اور دیدہ ودل کی بیتابیاں اور دھڑکنیں سمیٹے ہوئے واپس ہوئے۔

باب زویلہ

آثار ومشاہد کی زیارت ایک اہم کڑی باب زویلہ بھی ہے۔ باب زویلہ آج کل باب المتولی کہا جاتا ہے۔ شارع غوری کے اختتام پر بلند وبالا سنگی دروازہ بہت اچھی حالت میں آج بھی موجود ہے۔ فصیل بند قدیم شہر قاہرہ کا یہ غربی دروازہ تھا، جس سے مغربی تجار اور کارواں شہر میں داخل ہوا کرتے تھے، اس گیٹ کے اندرونی جانب داہنی طرف مسجد المتولی ہے، جو فن تعمیر کے اعلیٰ نمونوں کو اپنے در وبام پر سجائے ہوئے ہے، شب دیجور میں کہکشاں کے مانند دعوت نظارہ دے رہی ہے، یہ ایک وسیع بلند ستونوں والی مسجد ہے اس کے امام ایک نابینا قاری ہیں، مصر کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ بہت سے اہل فضل ماضی میں نابینا تھے۔ اور آج بھی متعدبہ تعداد اور ملکوں کے مقابلہ میں نابینا علماء اور حفاظ کی مل جائے گی، کئی مساجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا جہاں کے

امام نابینا تھے، اس مسجد میں عشاء کی نماز پڑھی گئی لوگ سنت میں مشغول ہوگئے۔ امام صاحب دیر تک زور زور سے دعا مانگتے رہے، اس مسجد کے سامنے وسیع پارک ہے، مسجد اور فصیل کے مابین کمرے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں مسافروں کے قیام کا نظم ہوا کرتا۔

باب زویلہ کے روبرو وہ تاریخی مسجد بھی ہے جسے المسجد المعلق (لٹکی ہوئی مسجد) کہا جاتا ہے۔ شب میں جب مغربی دروازہ بند ہو جاتا تھا تو مسافروں کو رات گزارنے کے لیے یہی جائے پناہ تھی، جو شہر سے باہر تھی۔ اس مسجد کے اطراف میں خندق بنی ہوئی ہے۔ لیکن اس میں پانی نہیں بھرا ہوتا تھا۔ بلکہ اس میں ان کمروں کے دروازے کھلتے تھے جو مسجد کے اطراف میں مسافروں کے لیے بنائے گئے تھے۔ آج بھی وہ کمرے موجود ہیں لیکن ناقابل استعمال ہیں۔

عشاء کے بعد اس مسجد کے صدر دروازہ پر پہونچے مسجد بند ہو رہی تھی۔ لیکن ہم جانب کی رعایت واحترام میں امام صاحب نے تھوڑی دیر توقف کیا اور اندر لیجا کر دکھا دیا۔ اندر وسیع صحن ہے، جس پر پتھروں کی سلیں بچھی ہوئی ہیں، تین طرف فصیلیں ہیں، سامنے کا مسقف حصہ کھلے ہوئے حصہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے، مسجد بہت بوسیدہ معلوم ہوئی، رنگ وروغن اس کا اتر چکا ہے، لیکن عظمت اسلام کی شہادت اس کے در وبام میں مضمر ہے۔ باب زویلہ کو دیکھنے کی خواہش اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ وہ ایک عظیم تاریخی سرمایہ کا محافظ ہے اور اس کردار کا زندہ مشاہد ہے جس نے مشرق سے اٹھنے والے تاتاریوں کے سیل رواں کو پہلی بار تاریخ میں چیلنج کیا تھا۔ اور عین جالوت کے معرکہ میں اس کی بپھری موجوں کے طلسم ہوش ربا کو ہمیشہ کے لیے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

الملک المظفر سیف الدین قطز جو مشرقی خراسان کا رہنے والا تھا۔ تاتاریوں کے حملہ میں اس کا پورا خاندان تباہ ہوگیا۔ وہ ابھی نوعمر تھا، اس کو غلام بنالیا گیا، بکتے بکاتے وہ شام تک پہنچا، وہاں ایک دیندار گھرانے کا خادم ہوگیا، طبیعت میں صلاح تھی، برابر شیخ الاسلام حضرت عزالدین بن عبدالسلام کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، آقا نے اس کی دینداری اور امانت داری دیکھ کر بہت کچھ رعایتیں دے رکھی تھیں، ایک روز قطز خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت

سے مشرف ہوا، اور یہ دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ قطز تم جاؤ اللہ تعالیٰ تم کو بادشاہ بنائیں گے، اور تم تاتاریوں کو شکست دو گے، قطز نے اس خواب کا تذکرہ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام سے کیا، شیخ نے مبارک باد دی اور کہا جب تم چلو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہوں گے، اسی اثناء میں شام کے والی اور شیخ الاسلام کے درمیان ان بن ہوگئی، لہٰذا سرکاری طور پر انہیں شام سے نکل جانے کا حکم دیا گیا، شیخ نے مصر جانے کا ارادہ کرلیا، قطز کو جب معلوم ہوا تو اس نے شیخ کے ہمراہ مصر کا قصد کرتے ہوئے اپنے آقا سے اجازت چاہی، آقا نے اجازت دے دی، آقا کی اجازت پر وہ شیخ کی ہمرکابی میں مصر وارد ہوا۔ قطز کا تعلق مشرق کے امراء گھرانے سے تھا، لہٰذا فن سپہ گری، اسپ سواری، سیف زنی میں ماہر تھا، جرأت وشجاعت اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، شاہ مصر کی فوج میں وہ بھرتی ہوگیا، ترقی کرتے ہوئے چند سال میں سپہ سالار کے عہد پر فائز ہوا مصر کی حکومت آپسی رقابتوں کی وجہ سے کمزور ہوگئی تھی، لہٰذا بادشاہ کو معزول کر کے قطز خود بادشاہ بن بیٹھا اور الملک المظفر سیف الدین سے ملقب ہوا۔

ادھر مشرق میں تاتاریوں کے دست برد سے خلافت اسلامیہ پامال تھی، یہ طوفان بلا خیز شام کے افق پر بھی چھا رہا تھا اور شام بھی ہلاکو خان کی ہلاکت خیزیوں کی زد میں تھا، ہلاکو خان جب شام سے فارغ ہوا تو مصر کی طرف متوجہ ہوا فوج کشی سے پہلے اس نے بادشاہ مصر الملک المظفر سیف الدین قطز کو ایک خط لکھا اور اپنے پانچ معتمد علیہ سفراء کے ہمراہ مصر روانہ کیا، اس کے خط کا متن حسب ذیل ہے۔

''سالار اعظم شہنشاہ مشرق ومغرب کی جانب سے الملک المظفر اور مصر کے دیگر امراء کی خدمت میں ملکوں کے واقعات دیدۂ عبرت وا کرنے کے لئے کافی ہیں، ہمارے عزائم (ہمدوش ثریا ہیں) جھکائے نہیں جاسکتے، تم دوسروں سے نصیحت حاصل کرو اور اپنی قیادت ہمارے حوالے کردو، ہماری فتح وکامرانی کی داستان تمہارے کانوں تک پہونچ چکی ہوگی، ہم نے روئے زمین کو فساد سے پاک کیا ہے، الغرض تم بھاگتے رہوگے، ہم پیچھا کرتے رہیں گے، ہمارے گھوڑے تیز گام ہیں، تیروں پر نشانوں کی شان چڑھی ہے، ہماری شمشیریں کوندتی ہوئی بجلیاں ہیں، ہمارے

دلوں میں پہاڑوں کی صلابت ہے اور ہماری تعداد ریگزاروں کی مانند ہے۔

الملک المظفر سیف الدین قطز نے مندرجہ بالا خط پڑھ کر بے انتہا برافروختہ ہوا اور سفراء کے سر قلم کئے جانے کا حکم دیا، یہی وہ تاریخی باب زویلہ ہے جہاں ان پانچوں سفراء کو قتل کیا گیا تھا اور وارد ین وصادرین کی دید کے لئے ان کے سروں کو لٹکایا گیا تھا اس کے بعد المظفر نے بھرپور تیاری شروع کی، شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام نے پورے مصر میں سورۃ التوبہ پڑھنے کی ترغیب دی، خطباء نے جہاد پر تقریریں کیں، پورا مصر جہاد کے لیے تیار ہو گیا، تو الملک المظفر کی قیادت اور شیخ الاسلام کی رفاقت میں مصری افواج نے عین جالوت کے مقام پر تاتاریوں پر شب خون مارا، گھمسان کی جنگ ہوئی، ہلاکو خان، چنگیز خان کی وفات کی خبر سن کر پہلے ہی واپس ہو چکا تھا، اس کا قائم مقام سپہ سالار مارا گیا، تاتاری فوج کو زبردست ہزیمت ہوئی اور اس کا چڑھتا ہوا سورج عین جالوت کے دلدل میں دھنستے ہوئے ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا اور مسلم علاقوں سے قیامت بلاخیز مصیبتوں کا دور باب زویلہ کے راستے سے دور ہو گیا۔ جب ہم اس دروازے پر پہونچے تو تاریخ کی ایک ایک کڑی یادداشت کی سلوٹوں سے گذرتی ہوئی معلوم ہوئی، تھوڑی دیر کے لیے ہم انہیں یادوں میں کھو گئے۔

باب زویلہ جس سڑک کے آغاز یا اختتام پر واقع ہے، وہ لکھنؤ کی چوک اور اکبری گیٹ کے درمیان واقع سڑک کے مثل ہے، دونوں طرف قدیم عمارتیں ہیں اور تنگ گلیوں اور زرق برق بازاروں کا سلسلہ ہے، کثرت سے مسجدیں ہیں، اس میں ایک مسجد سام بن نوح کے نام سے بھی ہے، بہت قدیم اور بوسیدہ ہے اس میں بھی نماز پڑھی گئی، کہا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام مصر تھا، جس کی طرف مصر کا انتساب کیا جاتا ہے، الملک المظفر سیف الدین قطز کا یہ کارنامہ مصریوں نے فراموش نہیں کیا، لہٰذا اس کا تذکرہ ازہر کی تاریخ کی نصاب میں داخل ہے، اور مصر جدیدہ (نیو قاہرہ) میں جمال عبدالناصر کے عہد میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی گئی ہے جس کا افتتاح جمال عبدالناصر نے کیا تھا۔ اس کا نام مسجد الملک المظفر سیف الدین قطز ہے۔

پانوراما

یہ فرانسیسی لفظ ہے جس کے معنی غالباً جنگی واقعات کو متشکل انداز میں پیش کرنا ہے۔ یہ مرکز مصر الجدیدہ میں شارع صلاح سالم پر واقع ہے، یہ ایک عظیم گنبد والی مسجد ہے، جیسے نظام فلکی کو دکھانے کے لئے بعض شہروں میں پختہ گرہوں کو بنایا گیا ہے۔ رمضان المبارک کے دوسرے عشرہ میں اس مرکز کو دکھانے کے لئے ازہر کی طرف سے لے جایا گیا۔ کیمپس کے غیر مسقف حصہ میں ایک طرف ۶/اکتوبر ۱۹۷۳ء میں اسرائیل اور مصر کے مابین جنگ کے دوران استعمال شدہ اسرائیلی اسلحوں کی نمائش کی گئی ہے، اور دوسری طرف مصری بمبار طیاروں، ٹینک شکن توپو، میزائیل اور دیگر آلات حرب سیاحوں کے لئے سجا کر رکھے ہوئے ہیں، اس حصہ کو دیکھ کر ہم فارغ ہوئے تو ۶/اکتوبر کی جنگ کا بچشم خود مشاہدہ کرنے کے لئے اس مرکز میں داخل ہوئے، مصر کی جدید تاریخ میں ۶/اکتوبر کی بڑی اہمیت ہے، لہٰذا بعض قومی شاہراہوں، پارکوں اور سپر بازاروں کا نام بھی اس کے ساتھ رکھا گیا، رمضان المبارک میں مصری فوج نے نہر سویز سے لگی بار یولائن جو ناقابل تسخیر سمجھی جاتی تھی، روزے کی حالت میں اس کو مسخر کر لیا تھا اور وادی سینا میں مصری فوج دور تک یلغار کرتی ہوئی چلی گئی تھی، اس لائن کی تسخیر میں دو بدو جنگ کرنی پڑی تھی۔ نہر سویز شدید بمباری کی وجہ سے آگ کے شعلوں میں ڈھکی ہوئی تھی۔ جانباز مصری فوج آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ اسرائیل کو اپنے وجود پر اندیشہ ہونے لگا تھا۔

بالآخر امریکا کی عیارانہ مداخلت کی وجہ سے یہ جنگ روک دی گئی، فوج کے ایک طبقہ میں رئیس انور السادات کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوگئی، اور بالآخر اسی نفرت کی وہ بھینٹ چڑھ گئے۔ پانوراما کی وسیع کشادہ اور خوبصورت عمارت کے اندر قرینے سے نشستوں کا نظم تھا، ہم سب بیٹھ کر عسکری مناظر کا مشاہدہ اس مدور اور متحرک پلیٹ فارم پر بنے ہوئے جنگی ماحول کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے لگے، جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ مصری افواج نے نہر سویز کو کس طرح عبور کیا اور یہودیوں کی ناقابل تسخیر بار یولائن کے پرخچے اڑا دیئے اس ایمان افروز مناظر نے تھوڑی دیر کے

لئے دنیاو مافیہا سے ہمیں بے خبر کر دیا۔ متحرک پلیٹ فارم نے جیسے ہی اپنا چکر مکمل کیا ہم وادی سینا کے میدان جنگ سے قاہرہ کے سمن زاروں میں پہونچ چکے تھے، اس کے بعد اور مقامات پر لے جایا گیا جہاں بمبار طیاروں اور جنگی تنصیبات پر مصری افواج کے وار اور نشانوں کی عکس بندی کی گئی تھی، ایک جگہ راہداریوں میں ایک خوبصورت شیشے کا بکس تھا جس میں میدان جنگ کا واقعی نقشہ پیش کیا گیا تھا، وہاں ایک خوبرو نوجوان موجود تھا، جس نے ہمارے سوالات کے جوابات بڑی سنجیدگی اور خوبی سے دیا یوں جہاں بھی جانا ہوا مصریوں کو با اخلاق اور مہذب ہی پایا، اور ہندوستان سے وہ بڑی محبت کرتے ہیں، پانوراما کے مناظر سے جرأت وشجاعت حوصلہ اور اولوالعزمی کی فروزاں قندیلیں لئے اپنی رہائش گاہ پر واپس ہو گئے۔

جامعة القاهره میں حاضری

جامعۃ القاہرہ جسے پہلے فواد یونیورسٹی کہا جاتا تھا، اب قاہرہ کی ترقی یافتہ یونیورسٹی ہے، قاہرہ یونیورسٹی جیزہ میں واقع ہے، جو دریائے نیل کے اس ساحل پر ہے جہاں فرعونی آثار کے بیش قیمتی نمونے آج بھی موجود ہیں، قاہرہ یونیورسٹی دیکھنے کی خواہش اس لئے پیدا ہوئی کہ علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت کے لئے ایک خاص نہج پر الازہر سے جداگانہ طرز پر ۱۸۷۲ء میں علی پاشا مبارک نے دارالعلوم قائم کیا تھا، اس دارالعلوم کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حقیقت میں یہ وہ دارالعلوم ہے جس کو علامہ رشید رضا مصری نے قائم کیا تھا، ان کا خیال تھا کہ وہی علماء اسلام کی اچھی طرح تبلیغ کر سکتے ہیں جو قدیم وجدید دونوں علم سے بہرہ ور ہوں، ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں نے ایک انقلاب برپا کر کے ایک نیا آئین نافذ کیا تو سید رشید رضا کو ایسے دارالعلوم کے قیام کا خیال دامن گیر ہوا جس میں اعلیٰ دینی تعلیم کے علاوہ علوم جدیدہ کی تدریس کا بھی انتظام ہوا، اس کے لیے انہوں نے قسطنطنیہ کا سفر کیا اور قسطنطنیہ میں سال بھر ٹھہرے رہے لیکن حکومت نے دارالعلوم کے قیام کے لئے ایسی شرائط عائد کر دیں جنہیں وہ قبول نہ کر سکے اور وہ دل برداشتہ ہو کر قاہرہ لوٹ آئے اور یہاں یہ فیصلہ کیا کہ یہ دارالعلوم قاہرہ میں قائم کیا جائے، چنانچہ دارالعلوم کی رسم افتتاح ۱ر ربیع الاول ۱۳۳۰ھ مطابق ۳ر مارچ ۱۹۱۲ء کو ہوئی، علامہ رشید

رضا کی قیادت میں اس دارالعلوم نے بڑی شہرت حاصل کی عرب وعجم کے طلباء اس میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آنے گلے لیکن یہ دارالعلوم انگریزوں اور مصری حکومت کے عتاب کا شکار ہوااور زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)

۱۹۴۶ء میں اس دارالعلوم کا الحاق فواد یونیورسٹی (الجامعۃ القاہرہ) سے ہوا، لیکن اس کی عمارت الگ قائم تھی، بعد میں کچھ تحفظات کے ساتھ دارالعلوم کو جامعۃ القاہرہ کے احاطہ میں ایک لق ودق سہ منزلہ عمارت میں منتقل کر دیا گیا، اس عمارت کی انفرادی حیثیت باقی رکھنے کے لئے آج بھی اس کی پیشانی پر موٹی جلی حروف میں دارالعلوم لکھا ہوا ہے، دارالعلوم کی اصطلاح علمی مراکز کے لئے شاید پہلی دفعہ مصر کی سرزمین پر استعمال ہوئی، اس ادارہ کو مصر کے مسلم اساتذہ کی بہت بڑی تربیت گاہ ہونے کا فخر حاصل ہے بڑے بڑے ادباء اور اہل قلم اس دانش کدہ سے فارغ ہوئے شیخ مفتی محمد عبدہ جن کی زندگی کا بڑا مقصد جامعۃ الازہر کی اصلاح وترقی تھا، اس کی قدامت اور مرکزیت کی وجہ سے ان کا یہ خیال تھا کہ اگر جامعۃ الازہر کی اصلاح ہوگئی اور اس کا تعلیمی نظام زمانے کے چیلنجوں کو پورا کرنے کے لائق ہو گیا تو پورے عالم اسلام کی اصلاح ہو جائے گی۔ انہوں نے بھرپور کوشش کی۔

چنانچہ ۱۸۹۰ء میں ایک سرکاری فرمان کے ذریعہ ایک انتظامی کمیٹی مقرر کر دی گئی، اس کے وہ فعال رکن مقرر کئے گئے، اس انتظامی کمیٹی نے اساتذہ کی تنخواہ میں اضافہ کرایا، گریڈ مقرر کئے، اور ہر درجہ کے لئے کتابیں مقرر کی گئیں، طلباء کی رہائش گاہوں میں صفائی اور روشنی کا بہتر انتظام کیا گیا نصاب تعلیم میں حساب، الجبرا، تاریخ اسلام اور سائنسی مضامین شامل کئے گئے، جامعۃ الازہر میں پہلی بار ادب کی تعلیم کے لئے الکامل (المبرد) اور دیوان حماسہ جیسی اہم کتابیں داخل کی گئی اور سب سے بڑھ کر طلبا کو روزانہ حاضری اور سالانہ امتحان میں شامل ہونے کا پابند قرار دیا گیا، ان کی اس اصلاحی کوشش کو ازہر کے شیوخ برداشت نہ کر سکے، ان پر معتزلی ہونے اور تجدد پسندی کا الزام رکھا گیا، اور بالآخر انہیں ازہر سے مستعفی ہونا پڑا اور ازہر اپنے قدیم ڈگر پر چلنے لگا۔

شیخ محمد عبدہ

یہی وہ زمانہ ہے، جب شیخ مفتی محمد عبدہ کو اپنی اصلاحی اور ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے دارالعلوم کا سہارا مل جاتا ہے۔ جہاں ان کے نامور تلامذہ پیدا ہوئے مصر کی ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں اس ادارہ کا بڑا حصہ ہے، اس کے نامور فضلاء میں مصطفیٰ لطفی منفلوطی، محمد فرید وجدی، احمد امین، طٰہٰ مصطفیٰ، صادق الرافعی محمد مصطفیٰ المراغی، ابراہیم عبدالقادر المازنی، عبدالوہاب عزام، عباس محمود العقاد، محمد حسین ہیکل اور قریبی دور میں ممتاز اہل قلم اور ادب اسلامی کے نقیب عبدالرحمٰن رافت پاشا کا نام لیا جاتا ہے۔

جامعۃ القاہرہ جو اپنے آغوش میں دارالعلوم سجائے ہوئے ہے دیکھنے کی خواہش فطری تھی، اور ایک ایسے طالب علم کے لئے جس کا انتساب ایک ایسے شہرہ آفاق ادارہ کی طرف ہے جس کی اصلاحی اور ادبی تاریخ میں جامعۃ الازہر کی اصلاحی اور ادبی دور کی بازگشت نہ صرف سنائی دیتی ہے بلکہ اس کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں مصری ادب کا عکس جمیل ہیں، یہ کیسے ممکن تھا کہ اس دانش کدہ علم کی زیارت کے بغیر ہی مصر سے واپس ہولیا جائے، لیکن جامعۃ القاہرہ میں غیر ملکیوں کے جانے پر پابندی ہے، طلباء بھی اپنے شناختی کارڈ کے ذریعہ ہی اندر جاسکتے ہیں۔ اندر لے جانے کی ذمہ داری مولوی عبدالسمیع ندوی نے قبول کی، اسکے لیے وہ کوشاں رہے۔ بالآخر ان کی یہ کوشش کامیاب رہی۔ انہوں نے ہندوستان ایمبیسی کے مرکز الثقافی کی جانب سے ایک خط حاصل کرلیا۔ جو جامعۃ القاہرہ کے ذمہ داروں کے نام لکھا گیا تھا۔ جس میں مرکز الثقافی کے مہمان کی حیثیت سے مجھے دکھایا گیا تھا۔ مرکز الثقافی کے ذمہ دار ڈاکٹر احسان صاحب کی طرف سے یہ خط لکھا گیا تھا۔ جب ہم صدر گیٹ پر پہنچے تو وہ شناختی کارڈ طلب کیا گیا جو الازہر کی المجلس الاعلیٰ کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ ہر طرح سے اعتماد کر لینے کے بعد اندر جانے کی اجازت دی گئی، سب سے پہلے جامعہ کے کتب خانہ دیکھنے گئے۔ اس وقت ششماہی امتحان چل رہا تھا طلباء امتحان ہال سے باہر آچکے تھے۔ اور لانوں میں ان کے مخصوص جمگھٹے قوس وقزح کا ہالہ بنے ہوئے تھے، زینوں کو طے کر کے ہم کتب خانہ کی عمارت میں داخل ہوئے جہاں لاکھوں کی تعداد میں کتابوں کا

عظیم سرمایہ موجود ہے، اس کے دیگر شعبوں کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ اس حصہ میں بھی گئے، جہاں اہل قلم کے وہ مقالات جمع ہیں جن کی تحقیق پر ڈاکٹریت کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ اس میں ایک مقالہ سرسید احمد خاں پر بھی ہے جو کئی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ مقالہ کو ادھر ادھر سے دیکھا۔ محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار کوئی مصری عالم ہیں، وہاں سے کلیۃ الادب اور السنۃ مشرقیۃ کے شعبہ اردو میں حاضر ہوئے۔ جہاں ڈاکٹر جلال الحفناوی اردو کے پروفیسر ہیں، جن سے میری ملاقات ندوۃ العلماء میں ہو چکی تھی۔ ۱۹۹۷ء میں پٹنہ کے ادب اسلامی کے سیمنار میں بھی حاضر تھے، دلی میں بھی ملاقات ہوئی تھی، معلوم ہوا کہ ہندوستان سے وہ قاہرہ واپس آ چکے ہیں۔ لہٰذا ان کے شعبے میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا لیکن اس وقت موجود نہیں تھے۔ ملاقات نہ ہو سکی۔

دارالعلوم میں حاضری

جامعۃ القاہرہ کی پشت پر دارالعلوم کی گلابی پرشکوہ عمارت موجود ہے۔ جو جامعۃ القاہرہ میں ہوتے ہوئے بھی بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتی ہے۔ جامعۃ القاہرہ کے برعکس وہاں کی فضاء میں متانت علمی سنجیدگی اور فکری بلندی کا احساس ہوا، طالبات مہذب لباس زیب تن کئے ہوئی نظر آئیں، لیکن طلباء مغربی لباس ہی میں نظر آئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل مولوی عبدالسمیع ندوی، مولوی محمد عزیز ندوی اور مولوی شعیب اسلم ندوی اور مولوی عمران فراہی ندوی کا علمی تعلق اسی دارالعلوم سے ہے۔ بعض حضرات اس میں ایم۔اے، کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ اور بعض پی۔ایچ۔ڈی کی تیاری میں مصروف ہیں۔ دارالعلوم کے اندر داخل ہوئے تو ہر طرف مختلف کتبے آویزاں نظر آئے جن میں علم کے موضوع پر آیات قرآنیہ، احادیث نبویہؐ اور مفتی محمد عبدہ کے مقالات سے اقتباسات کو بڑے قرینے سے سجایا گیا ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر حسین الشافعی جو دارالعلوم کے مشہور پروفیسر ہیں ان سے ملاقات کے لئے ان کے چیمبر میں حاضر ہوئے، لیکن وہ ابھی تک آئے نہیں تھے۔ ڈاکٹر محمد الشافعی، ڈاکٹر محمد یوسف القرضاوی کے معاصر ہیں ان کا شمار چوٹی کے علماء میں ہوتا ہے، دارالعلوم کے عمید طاہر حامد اپنے دفتر میں موجود تھے، ان سے جب اجازت چاہی گئی تو ندوی انتساب کی وجہ سے فوراً آنے کی اجازت دے دی۔ اور والہانہ استقبال کیا اور فرمانے لگے کہ ہم

ندوی کے معنی عالم وفاضل اور باخبر کے جانتے ہیں۔ حضرت مولانا مدظلہ سے بخوبی واقف ہیں۔ گفتگو کے دوران کہنے لگے" ہوا بونا ہو معلمنا" شیخ ندوی ہمارے (علمی روحانی) باپ ہیں، ہمارے استاذ ہیں، دیر تک ان سے گفتگو ہوئی، اپنی بعض نگارشات بھی انہوں نے پیش کئے۔ ابھی تک ہندوستان کو نہیں دیکھا ہے۔ لیکن ہندوستان سے انہیں بڑی عقیدت ہے۔

انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ دارالعلوم دیکھنے کے لئے ہمیں کن کن مرحلوں سے گزرنا پڑا تو انہوں نے مولوی عبدالسمیع صاحب سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ جب آئندہ کسی کو لانا ہو تو دارالعلوم کے سامنے والے گیٹ سے لائیں۔ اور میرا حوالہ دے دیں کوئی نہیں روکے گا دارالعلوم کے مکتبہ کو بھی دیکھا۔ درجات دیکھے امتحان کی وجہ سے سب خالی تھے اور پت جھڑ کے موسم کا سماں پیش کر رہے تھے۔ دارالعلوم کے قریب پارک میں ایک چھوٹی سی ہشت پہلو مسجد بنی ہوئی ہے، ظہر کی نماز اسی میں ادا کی گئی، جماعت تو ہو چکی تھی، لیکن طلباء اور اساتذہ کا سلسلہ جاری تھا۔ وہاں بعض اخوانی طلباء سے بھی ملاقات ہوئی جو باریش بھی نظر آئے، اخوان المسلمین پر جب سے پابندی عائد ہوگئی ہے، آج تک یہ جماعت قید وبند کی صعوبتیں جھیل رہی ہے۔ اس جماعت سے تعلق رکھنے والے ہزاروں بے گناہ نوجوان مصری جیلوں میں پڑے ہوئے ہیں جن کی آہ وبکا انصاف کے ایوانوں تک پہنچ نہیں پاتی، انہیں اپنے کیس کو کسی عدالت میں پیش کرنے کی بھی سہولت حاصل نہیں ہے، فوجی عدالتیں ہیں، جہاں حق وصداقت کی بنیاد پر ملزم اپنی صفائی نہیں پیش کر پاتا اور فیصلہ یک طرفہ ہوجاتا ہے، بہرکیف یہ وہاں کا سیاسی مسئلہ ہے اخوان المسلمین کی ٹکراؤ کی سیاست نے اسے فائدے سے زیادہ نقصان پہونچایا ہے، کرسی تک پہنچنے کے بجائے اسلام کو کرسی تک پہنچانے کی کوشش زیادہ سودمند ہوسکتی ہے، چنانچہ جہاں اخوان المسلمین پر شدت پسندی کا الزام ہے تبلیغی جماعت کو دعوت تبلیغ کی کھلی اجازت ہے۔

مرکزالدعوۃ طموہ میں حاضری

سابق صدر انوارالسادات کے زمانہ میں مدینۃ النصر میں واقع تبلیغی مرکز کی عالیشان عمارت خالی کرائی گئی تھی، اور دعوتی سرگرمیوں پر شدت کے ساتھ پابندی عائد کردی گئی تھی، لیکن

صدر حسنی مبارک کے دور میں حالات کچھ بدلے ہیں، پہلی عمارت تو حکومت نے واپس نہیں کی، البتہ شہر سے کافی دور حلوان کے قریب فوجی چھاؤنی کے قریب طمومہ میں دعوتی سرگرمیوں کی اجازت نئے سرے سے دیدی گئی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ اس مرکز میں غیر ملکی جماعتیں نہیں آئیں گی۔

ہم مولانا قمر الحسن اور مولوی سعد کے ہمراہ جمعہ کے دن نماز جمعہ و جماعت ادا کرنے کی غرض سے طمومہ روانہ ہوئے، ''تحریر'' چوک تک بس سے آگئے، پھر زمین دوز ٹرین میٹرو کے ذریعہ جو آگے حلوان تک جاتی ہے، طمومہ کے لئے روانہ ہوئے، طمومہ دریائے نیل کے داہنی طرف ریلوے اسٹیشن ہے، آبادی کے اعتبار سے متوسط درجہ کا ایک قصبہ معلوم ہوا، تھوڑی دور پیدل چلنے کے بعد دریائے نیل کے کنارے پہنچ گئے، تھوڑی دیر اسٹیمر کا انتظار کرنا پڑا کچھ اور لوگ بھی آگئے، اس میں بعض وہ بھی تھے جو مرکز الدعوۃ کے قصبے ہی سے آئے تھے، ایک صاحب سفید عبا زیب تن کئے ہوئے، چہرہ پر گھنی ڈاڑھی تھی، تبلیغی معلوم ہو رہے تھے، انہوں نے اسٹیمر کا از خود کرایہ بھی ادا کر دیا، لیکن سلام دعا کے علاوہ مزید کوئی گفتگو نہ ہو سکی، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ تحفظات مانع ہوں جب ہم لوگ مرکز پہنچے تو جمعہ کا خطبہ شروع ہو چکا تھا، شیخ فرید عراقی جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، جس کا موضوع دعوتی تھا، نماز سے فراغت کے بعد شیخ عراقی سے ملاقات کے لئے ان کے مخصوص کمرہ میں جو دوسری منزل پر تھا جانا ہوا، بہت تپاک سے ملے، ہندوستان اور خصوصاً ندوہ کا تذکرہ آیا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ لکھنؤ کئی دفعہ حاضر ہو چکا ہوں اور ندوہ میں بھی حاضری کی سعادت حاصل ہو چکی ہے، بڑے با اخلاق، خوش طبع، مسرت خیز طبیعت کے حامل ہیں۔

سات امراء

شیخ عراقی ان سات مصری امراء میں ایک ہیں جن کے اوپر مصر میں دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری ہے، میں نے ان سے پوچھا کہ آخر اس مرکز میں غیر ملکیوں کے آنے جانے کے اجازت کیوں نہیں، تو مسکرا کر ٹال گئے، ایسا محسوس ہوا کہ زیر لب حرفوں نے دم توڑ دیا ہے، غیر ملکی طلباء جو ازہر اور دیگر یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں وہ مدینۃ النصر کی ایک مسجد میں جمع ہوتے

ہیں اور خاموشی کے ساتھ دعوت وتبلیغ کا کام کرتے ہیں، ملیشیا کے طلباء اس میں ممتاز ہیں برما بنگلہ دیش کے طلباء بھی شریک ہوتے ہیں بعض ہندوستانی طلباء بھی کبھی کبھی آجاتے ہیں، جامعۃ الازہر کے مکتبۃ الایمان میں دعوت وتبلیغ کے موضوع پر دکتور عبدالخالق کی کتابیں گیارہ جلدوں میں دیکھیں، اس سے اندازہ ہوا کہ طلباء ازہر میں یہ کام معروف ہی نہیں بلکہ کسی حد تک زندہ ہے۔

دکتور عبدالخالق صاحب

لاہور کی بادشاہی مسجد کے سابق امام مولانا عبدالقادر صاحب زید لطفہ کے چھوٹے بھائی ہیں، ابتدائی تعلیم لاہور میں ہوئی، فراغت جامعہ اشرفیہ لاہور سے حاصل کی، تجارت کے ساتھ تعلیم کا مزید شوق ہوا تو مصر چلے آئے، اور ایک عرصہ تک رہ کر جامعہ ازہر سے پی.ایچ.ڈی. کی ڈگری حاصل کی، اور وہیں السنۃ مشرقیہ کے اردو ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر ہوئے، بڑے زندہ دل انسان ہیں، مطالعہ وسیع اور معلومات متنوع اور علم گہرا ہے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کا اہم کارنامہ تبلیغی جماعت کا وہ ہمہ گیر تعارف ہے جس پر گیارہ جلدیں عربی زبان میں شائع ہو چکی ہیں، اپنی تصنیفات کا ایک پورا سیٹ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی خدمت میں دینے کے لئے پیش کیا اور ایک سیٹ راقم السطور کو بھی عنایت کیا، زمین دوز ٹرین میٹرو کے اسٹیشن الملک الصالح کے پڑوس میں واقع ایک عمارت کی چوتھی یا پانچویں منزل کی ایک فلیٹ میں رہتے ہیں، چند دنوں میں پاکستان واپسی کا پروگرام تھا، اس لئے ملاقات کی خواہش ہوئی، مولوی مبین الدین ندوی بھوپالی ان سے بہت قریب تھے، ان کی معرفت ہی ان کے پاس جانا ہوا۔ ان کی اہلیہ ایک مصری ہیں، ایک بچی بھی ہے، پہلی بیوی پاکستانی ہیں، جو پاکستان میں رہتی ہیں۔

چند دنوں میں کئی بار ملاقاتیں ہوئیں، ہشاش بشاش مرنجان مرنج اور مجلسی آدمی ہیں۔ گفتگو بے تکان کرتے ہیں۔ ناقدانہ مزاج ہے، پاکستانی علماء کی آپسی چشمکوں سے بہت نالاں معلوم ہوئے، کہنے لگے کہ عالم اسلام میں صرف ایک ہی عالم اور وہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ہیں، حضرت مولانا سے بڑی عقیدت اور محبت کا اظہار فرماتے تھے، چند دنوں کے بعد وہ پاکستان چلے گئے، اس مکان میں ایک پاکستانی طالب علم اور مولوی کلیم گوہر ندوی رہتے ہیں، اس مذکورہ طلباء کی دعوت پر ایک دفعہ اور اس مکان پر جانا ہوا، ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کی بہت یاد آئی۔ ڈاکٹر صاحب ایک شب اپنی چھت کے کھلے ہوئے حصے میں لے گئے۔ اور فرمانے لگے آیئے آپ کو وہ جگہ دکھائیں جہاں حضرت عمرو بن العاصؓ نے ماری گریس کے کنیسہ میں محاصرہ کے وقت قیام فرمایا تھا۔ کھلی ہوئی چھت سے اسلامی فوج کے قیام کا خاکہ سمجھانے لگے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ گھر بھی اسی مقام پر واقع ہے جہاں اسلامی فوجوں نے محاصرہ کے دوران کیمپ لگایا تھا۔ (واللہ اعلم)

کمال زوریمی سے ملاقات

کمال زوریمی ملیشیا کے رہنے والے ندوہ کے سابق طالب علم ہیں، ندوہ سے عالمیت کرنے کے بعد کلیۃ الدعوۃ میں زیر تعلیم ہیں، ندوہ میں اصول حدیث کے مشہور کتاب نخبۃ الفکر راقم السطور سے پڑھی ہے، اس نسبت سے کئی دفعہ ملنے آئے، مدینۃ النصر میں ایک فلیٹ لے کر رہتے ہیں، قاہرہ میں کمرہ کرایہ پر نہیں ملتا بلکہ پورا فلیٹ ملتا ہے اور اس میں ضرورت کی ساری چیزیں، پلنگ، بیڈ، فریج، سوفا سیٹ ٹیلیفون، اور نیز ٹی وی کی بھی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں، ان سہولتوں کے اعتبار سے کرایہ بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، لہٰذا ازہر کے کچھ بیرونی طلباء خصوصاً جو نئے ہوتے ہیں انہیں شہر میں اقامت کرنی پڑتی ہے، جس کی وجہ سے طلباء پریشان بھی رہتے ہیں، معمولی سے معمولی فلیٹ، شقہ، ڈھائی ہزار، تین ہزار ماہانہ کرایہ سے کم پر دستیاب نہیں ہوتا، اس معاملہ میں ملیشیا کی حکومت کا رول اپنے طلباء کے تعلق سے بہت ہی ہمدردانہ ہے۔ ملیشین طلباء اسی لیے **مدینۃ المبعوث** میں نہیں رہتے، وہاں کی حکومت نے مدینۃ النصر میں بڑے بڑے کثیر منزلہ رہائشی کامپلکس بنا رکھے ہیں، جہاں ملیشیا کے طلباء اور طالبات دونوں کی الگ الگ رہائش کا نظم ونسق کیا گیا ہے، جن کی تعداد کئی ہزار ہے، اس کے تحفظ کے لئے چوکیدار وغیرہ بھی رہتے ہیں، قیام کی سہولت مفت ہے مزید برآں ہر طالب

علم کو کم سے کم انڈین دس ہزار روپے ماہانہ خرچ کے لئے ملتے ہیں، لہٰذا یہ طلباء دیگر طلباء کے مقابلہ میں بڑے فارغ البال نظر آئے، ان کی جمعیت بھی ہے، اس میں وہ اپنا پروگرام بھی کرتے ہیں۔

لیکن ان تمام سہولتوں کے لیے ایک لازمی شرط ہے، وہ یہ کہ طالب علم ہر سال دینی تعلیم میں کامیاب ہو، ورنہ اس کی سہولت ختم کردی جاتی ہے، کمال زوریی کا تعلق دوسرے طبقے سے تھا، لہٰذا الگ قیام کا نظم کرنا پڑا تھا، مجھے اپنی رہائش گاہ پر لے جانا چاہتے تھے، لیکن مضطرب تھے، اس لئے کسی داڑھی والے کو کس شقہ میں جاتے ہوئے اگر پولیس دیکھ لیتی ہے تو کبھی کبھی مکینوں کی جان پے بن آتی ہے، تحقیق شروع ہو جاتی ہے، لہٰذا ہر طرح اطمینان کر لینے کے بعد ان کے یہاں جانا ہوا، عمدہ فلیٹ میں وہ اور ان کے ایک ساتھی رہتے تھے، انہوں نے میرے ساتھ مولوی عرفان اعظمی ندوی اور مولوی مدثر احمد نیپالی ندوی کو بھی دعوت دی تھی، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تھوڑی دیر علم کی اہمیت اور قاہرہ آنے کے مقاصد پر روشنی ڈالی گئی کمال زوریی اردو سمجھ لیتے ہیں اور بولنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان کا دوست اردو سے بالکل واقف نہیں تھا، لہٰذا عربی میں ہی کچھ نصیحت کے کلمات کہنے پڑے، بعض اور دوسرے طلباء اور مولوی ہشام ندوی انڈونیشی اور مولوی محمد شاہد ہارون بنگلہ دیشی نے بھی مختلف موقع پر دعوت کا انتظام کیا اس طرح ان کے دیگر رفقاء سے بھی ملاقات وتعارف کا موقع ملا۔

مولانا ابوالکلام آزاد سینٹر

ہندوستان کی انڈین ایمبیسی ''زمالک'' میں واقع ہے، جہاں اور بھی ملکوں کے سفراء اور ان کے قونصل خانے ہیں، قاہرہ کے حساس علاقوں میں اس کا شمار ہوتا ہے، لیکن ہندوستان کا المرکز الثقافی جو مولانا ابوالکلام کے نام سے موسوم ہے وہ تحریر میں واقع ہے، تحریر قاہرہ کا ترقی یافتہ اور فیشن ایبل علاقہ ہے، زمین دوز ٹرینوں میٹرو کا مرکز دریائے نیل کے حسین ساحل پر واقع ہے، مصر کا قومی میوزیم (جس میں عہد فراعنہ کے تمدنی نمونوں کو سلیقے سے رکھا گیا ہے) اس جگہ یہی وہ میوزیم ہے جس کے ایک مخصوص حصہ میں کئی ممی شدہ لاشیں رکھی ہوئی ہیں، زجاجی بکسوں میں ایک

لاش فرعون موسیٰ کی بھی بتائی جاتی ہے، فرعون کا نام رعمسیس ثالث لکھا ہوا ہے، ان آثار اور خصوصاً شاہان فراعنہ کی ممی شدہ لاشیں دیکھنے کے لئے سیاحوں کی کثرت سے آمد ورفت ہوتی رہتی ہے، تحریر کے معنی عربی زبان میں آزادی کے ہیں، پہلے اس کو کسی اور نام سے جانا جاتا تھا لیکن جب مصر میں ۱۹۵۱ء میں انقلاب آیا تو مجاہدین آزادی نے اسی چوک میں آزادی کا اعلان اور جشن منایا تھا۔ لہٰذا اسے میدان التحریر کہنے لگے۔

اسی چوک سے قریب مرکزی بازار کے نکڑ پر المرکز الثقافی کا صدر گیٹ ہے۔ اندر کشادہ شاندار عمارت ہے، اس کی مرکزی راہداری میں ہندوستانی دیومالائی تصویریں لگی ہوئی ہیں، ایک گوشہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر قومی رہنماؤں کی روغنی تصویریں دیواروں پر آویزاں ہیں۔ راہداری کے اختتام پر داخلی حصہ میں وہ کمرہ ہے جو المرکز الثقافی کے ڈائریکٹر کا آفس ہے، اس کے نیچے ایک ہال بھی بنا ہوا ہے جہاں مختلف قسم کی پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں، اسی ہال میں جناب ڈاکٹر احسان صاحب ڈائیریکٹر المرکز الثقافی کی جانب سے ہمیں افطار پارٹی کی دعوت دی گئی، ہندوستانی طلباء میں مولوی عبدالسمیع ندوی، مولوی وحید احمد ندوی، مولوی انیس ندوی، مولوی کلیم گوہر ندوی، مولوی عزیر ندوی، اور دو طالبات جو ضلع مئو یوپی کی رہنے والی ہیں، مولانا محمد اقبال ندوی کی بھتیجیاں ہیں اور جامعہ ازہر کی کلیۃ البنات میں زیر تعلیم ہیں موجود تھیں۔ بلکہ ہندوستانی طرز کی افطاری انہیں دو بچیوں نے تیار کیا تھا۔ اور غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستانی طرز کی افطاری اور کھانے کی دعوت میں شریک ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر احسان صاحب جواہر لال نہرو کے پروفیسر ہیں، چار سال سے مصر میں قیام پذیر ہیں، اس سال جون کے اختتام تک ان کی مدت کارکردگی ختم ہو جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب بڑے خلیق وضعدار اور ہنس مکھ ہیں، قاہرہ میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جانے والے طلباء کی بڑی معاونت فرماتے ہیں، مئو کی ان دو بچیوں کو ویزا نہیں مل رہا تھا۔ اور یہ بہت پریشان تھیں قریب تھا کہ انہیں وطن واپس لوٹنا پڑتا، لیکن ڈاکٹر احسان صاحب کی حکمت عملی سے ان دونوں کو ویزہ مل گیا تھا۔

رمضان المبارک کا اہتمام

مصر میں رمضان المبارک کا بڑا اہتمام ہوتا ہے۔ شب بیداری کا عام رواج ہے۔ حکومت کی طرف سے ٹی.وی. کے ذریعہ ایسے پروگرام نشر کئے جاتے ہیں جو اسلامی ثقافت اور اسلامی شخصیات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ گذشتہ سال ۱۹۹۷ء میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر مشتمل سیریل پیش کیا گیا تھا۔ جب کہ اس سال رمضان المبارک جنوری ۱۹۹۸ء میں سیریل الائمۃ فی الاسلام اور القضاء فی الاسلام دکھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک بجے رات کے بعد یہ پروگرام شروع ہوتا تھا۔ اور سحری تک جاری رہتا تھا۔ پروگرام بہت دلچسپ اور معلوماتی بھی ہوتا تھا۔ اس پر حکومت کی طرف سے لاکھوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ اس سے قبل سلطان صلاح الدین ایوبی پر بھی سلسلہ وار پروگرام نشر کئے جا چکے ہیں۔

اذاعۃ القرآن الکریم کے دینی پروگرام

اذاعۃ القرآن الکریم قاہرہ میں چوبیس گھنٹے دینی پروگرام، تلاوت کلام پاک، علماء کی تقریریں، سوال و جواب کی نشستیں اور تراویح کی نماز نشر کی جاتی ہے۔ تراویح کی نماز اور صبح کی نماز اور اس سے پہلے ابتہالات کی مجلسیں براہ راست ٹی.وی. چینلوں پر بھی نشر کی جاتی ہیں (ابتہالات) مناجات پر مشتمل وہ اشعار ہوتے ہیں جنہیں ایک خاص لحن سے پڑھا جاتا ہے اس کے سننے کا مصر میں بڑا رواج ہے، صبح کی نماز سے پہلے پندرہ منٹ کی یہ نشست بڑی رقت آمیز ہوتی ہے، عام طور پر جامع الامام الشافعی سے (ابتہالات) کا پروگرام نشر کیا جاتا تھا۔

مائدۃ الرحمن

مصر میں برصغیر کی طرح افطار میں صرف افطاری کا نظم نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ افطار کے ساتھ کھانے کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ جگہ جگہ مائدۃ الرحمٰن خدائی دسترخوان کے نام سے افطار کا نظم دیکھنے میں آیا عموماً ہوٹلوں کے سامنے الحسین کے قریب فٹ پاتھوں پر مائدۃ الرحمٰن کا اہتمام ہوتا تھا۔ اس میں انواع اقسام کے کھانے بھی ہوتے تھے۔ فلمی اداکاروں کی طرف سے بھی اونچے پیمانہ پر مائدۃ الرحمٰن کا اہتمام کیا جاتا تھا اور ایسے جگہوں پر عوام الناس کی بھیڑ کچھ زیادہ ہی ہوتی تھی۔

ایک دفعہ ٹرام کے ذریعہ مولوی عبدالسمیع ندوی ریسرچ اسکالر جامعۃ القاہرہ کے یہاں جارہا تھا۔لیکن ٹرام کے ڈرائیور نے درمیان ہی میں ٹرام روک کر اعلان کیا کہ ٹرام آگے نہیں جائے گا۔اسی اثناء میں کچھ اور بھی ٹرام آکر وہیں رک گئے۔سٹی بس بھی سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔اور ڈرائیور کنڈکٹر اور سواریاں مائدۃ الرحمٰن سے سجے ہوئے شامیانوں میں جو سڑک کے ایک طرف لگائے گئے تھے۔شریک افطار تھے۔وہاں سے مولوی عبدالسمیع کا فلیٹ ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔وہاں تک پیدل جانا پڑا۔مائدۃ الرحمٰن کا سلسلہ پورے رمضان رہتا ہے (مدینۃ البعوث) میں افطار کا کوئی خاص نظم نہیں تھا۔اس لیے ہمارے بعض رفقاء پابندی سے لطف اٹھانے کے لئے عصر بعد ہی سے غائب ہوجاتے تھے۔

کلام من ذھب

آب زر سے لکھنے کی باتیں، یہ بھی ایک مخصوص پروگرام ہے، جو ہر ہفتہ پیر کے دن ہوتا ہے، اس پروگرام کے تحت کامیاب ہونے والوں کو عمرہ اور حج کا ٹکٹ دیا جاتا ہے۔معلوم ہوا کہ مصر کی بعض سرمایہ دار کمپنیاں یہ پروگرام چلاتی ہیں۔رمضان المبارک میں ہر روز اس پروگرام کے تحت نقد انعامات پیش کیے جاتے ہیں، پروگرام ترتیب دینے والے ٹی.وی.سیٹوں کے ساتھ کسی چوراہے، بس اسٹیشن، مارکیٹ، تعلیم گاہوں، اسپتالوں کے روبرو، پکنک اسپاٹوں، سیاحی مراکز، دریائے نیل کے کنارے، کسی مصروف سڑک پر کھڑے ہوکر کلام من ذہب کا اعلان کرتے ہیں، یہ سن کر ایک بھیڑ جمع ہوجاتی ہے۔پھر ان میں کا ایک فرد اسلامی شخصیات، اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اور سیرت صحابہؓ اور ائمہ اسلام کے تعلق سے بعض سوالات کرتا ہے۔مثلاً حلیمہ سعدیہ کے شوہر کا نام کیا تھا۔حلف الفضول کسے کہتے ہیں، عشرہ مبشرہ کون ہیں، حضرت عثمان کو ذوالنورین کیوں کہتے ہیں، اس قسم کے سوالات کے صحیح جوابات پر ہر روز ایک فرد کو حج اور عمرہ کا ٹکٹ ملتا ہے۔چونکہ اس پروگرام میں شرکت کے لئے کوئی عمر کی قید نہیں ہے، یہ پروگرام بہت اچھا لگا۔اور ان تنظیموں کے لیے دل سے دعا نکلی کہ انہوں نے نوجوانوں میں اسلامی تاریخ و ثقافت اور شخصیات کی معرفت کو عام کرنے کا ایک بہتر سبیل نکالی ہے۔اور اسی طرح حج وعمرہ کی سعادت

سے ایک بڑا طبقہ فیضیاب ہوتا رہتا ہے۔ مصر میں قرآن پاک پڑھنے کا بڑا رواج ہے۔ اس میں کلیدی کردار جامعۃ الازہر کا ہے۔ اس لئے کہ جامعۃ الازہر میں پڑھنے والا ہر طالب علم اور طالبات کے لیے حافظ ہونا ضروری ہے۔ بیرونی ممالک کے طلباء کے ساتھ تھوڑی سی رعایت ہوتی ہے۔ اس لئے چلتے پھرتے بسوں اور ٹراموں میں سفر کرتے ہوئے طلباء اور طالبات کو قرآن پاک پڑھتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ رمضان المبارک میں تلاوت کا اہتمام اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے کہ ششماہی امتحان بھی قریب ہوتا ہے اور اس میں زبانی اور تحریری دونوں طرح سے حفظ قرآن کا امتحان ہوتا ہے۔ اور اس میں پاس ہونا بھی ضروری ہے۔

ایک دن علی الصباح مدینۃ النصر سے مدینۃ البعوث کے لئے مولوی عارف جمال ندوی کے ہمراہ ٹرام کے ذریعہ روانہ ہوئے تو دیکھا کہ ٹرام میں لڑکیاں ہیں اور سب کے ہاتھوں میں قرآن پاک ہے۔ اور سب تلاوت میں مصروف ہیں۔ ایک خاتون اگلے اسٹیشن پر سوار ہوئیں فرانسیسی اسکٹ زیب تن کئے ہوئے، سر برہنہ بھی تھیں۔ میں نے سمجھا کہ یہ کوئی فرانسیسی یا انگریز خاتون ہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ دیکھا کہ پرس سے اس خاتون نے قرآن پاک نکالا اور تلاوت میں مصروف ہوگئیں۔ مصر میں بے شک بہت سی برائیاں ہیں اور مغرب سے قریب ہونے کی بناء پر مصر میں مغربی تہذیب کی چھاپ ہر طرف گہری دکھائی دیتی ہے۔ دین کی دوری کے بہت سے محرکات ہو سکتے ہیں، لیکن قرآن پاک پڑھنے اور یاد کرنے کا اس قدر رواج نہ ہوتا تو شاید مصر کی شبیہ دوسری ہی نظر آتی۔

قرآن پاک پڑھنے سے اسلام سے جو قربت ہوتی ہے۔ اس کا عام مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی جب مسٹر عبدالماجد دریا آبادی تھے تو قرآن پاک سے دوری نے انہیں ملحد بنا دیا تھا لیکن اکبر الہ آبادی کے کہنے پر جب انہوں نے قرآن پاک پڑھنا شروع کیا تو دل کی دنیا ہی بدل گئی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں مفسر قرآن بنا دیا، بہر کیف مصر کا قرآن پاک پڑھنے میں ایک امتیاز ہے، شرٹ اور پینٹ پہننے والے عام طور پر قرآن اچھا پڑھتے ہیں دوسرے ملکوں میں اس کا تصور بھی مشکل ہے۔

تراویح کی نماز عام طور پر حافظ یا قاری ہی پڑھاتا ہے بیس رکعت اور آٹھ رکعت تراویح پڑھنے کا عام رواج ہے، مفتی جمہوریہ کا فتویٰ دونوں کے مسنون ہونے کا ہے۔

لہٰذا وہاں اس سلسلہ میں کوئی خاص چشمک دیکھنے میں نہیں آئی، رویت ہلال کا اعلان بھی مفتی جمہوریہ کی طرف سے ہوتا ہے، ظاہراً حکومت اس میں مداخلت نہیں کرتی ہے۔

رمضان المبارک میں وزارت الاوقاف کی جانب سے اسلامی دینی پروگرام "الحسین" کے روبرو میدان میں پابندی سے ہوتے ہیں اور اسے ٹی.وی. سے بھی نشر کیا جاتا ہے۔

اذان کا اہتمام

مصر جس کے بارے میں ایک تجدد پسند ملک ہونے کا ہر کس وناکس کا خیال رہتا ہے وہاں برقت اذانوں نے بھی متاثر کیا اذان جب شروع ہوتی ہے تو اہم سے اہم بلٹین روک کر ٹی.وی. اور ریڈیو پر اذان نشر ہوتی ہے اس میں کوئی تکلف نہیں ہوتا دوسرے یہ کہ ہر چینل سے اذان نشر ہوتی ہے۔ لہٰذا ٹی.وی. دیکھنے اور ریڈیو سننے والا اذان سننے پر مجبور ہوتا ہے، وہاں کی ٹی.وی. کا ایک امتیاز یہ بھی نظر آیا کہ دینی پروگرام میں سوائے اسلامی پروگرام کے کوئی اور دینی پروگرام کسی اور مذہب کے تعلق سے نشر نہیں ہوتے۔

ایک شب کوہ طور کے دامن میں

مصر کی سرزمین جو عقیدت ومحبت کی سرزمین ہے، جو انبیاء کی دعوت کی امین اور اولیاء اللہ، علماء ومشائخ کے ریاضات ومجاہدات کی ترجمان ہے، اوالعزم پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام یہیں پیدا ہوئے اور دریائے نیل سے گزر کر فرعون کے محل تک پہنچے، پلے بڑھے اور جوان ہوئے، بنی اسرائیل کی زبوں حالی کا بچشم خود مشاہدہ کیا اس قوم کو اللہ عزوجل نے ایک بار پھر اٹھانا چاہا جو رسوا اور ذلیل تھی، اللہ عزوجل نے بنی اسرائیل کو عزت وسرفرازی عطا کرنے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتخاب فرمایا، اور اس اہم مہم کو سر کرنے کے لئے جس میں فرعون کی خدائی کا پاش پاش ہونا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی خاص نگرانی میں پروان چڑھا کر اس لائق بنایا گیا، ایک عرصہ کے بعد ایک تکوینی سبب کی وجہ سے مصر کو چھوڑ کر آپ مدین تشریف لے جاتے ہیں، تاکہ غریبوں اور مظلومین کی بے کس پناہی، غربت ومظلومیت کے ادوار سے گذرنے والے کے ذریعہ انجام پائے، حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر چھوڑ کر مدین چلے جاتے ہیں، اور وہاں حضرت شعیب علیہ السلام سے آپ کی ملاقات ہوتی ہے، آپ ان کے یہاں قیام فرماتے ہیں، اور دس سال قیام کے بعد مدین سے مصر واپسی کے دوران وادی شعیب کے ایک کشادہ مقام پر شب میں قیام فرماتے ہیں، رات ٹھنڈی ہے، باہر کی فضا یخ بستہ ہے، پہاڑی کے تنگ وتاریک دروں میں کسی رہنماء کی تلاش ہے، اہلیہ محترمہ کو دردزہ کا احساس ہوتا ہے، لہذا بصورت آگ خدا کی تجلی کا مشاہدہ کر کے آگ کی طلب میں اس لافانی روشنی کی طرف بڑھتے ہیں، وادی طویٰ کے قریب پہنچتے ہیں تو یہ آواز سنائی پڑتی ہے ''فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ، اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوىٰ '' اپنے جوتے اتار دیجئے، آپ مقدس وادی طوی میں ہیں، اس مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وابستہ تاریخ

کا ایک اہم باب وا ہو جاتا ہے، مصر کی سرزمین پر حاضر ہونے والا اس کی عین خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس مقدس وادی کی زیارت کرے اور شجرہ مبارکہ اور جبل موسیٰ کے نظاروں سے اپنے ایمان کی قندیلیں فروزاں کرے، قاہرہ کی مصروف زندگی سے نکل کر وادی سینا کے ریگزاروں میں بکھرے ہوئے ان موتیوں کی تلاش میں رمضان المبارک کی اکیسویں شب ۱۴۱۸ھ کو عزیز گرامی قدر مولوی عزیز ندوی سلمہ کے ہمراہ سینٹ کیتھرائیں حاضری ہوئی جو وادی سینا کے جنوب میں واقع ہے۔

صحرائے سیناء:

یہ تاریخی صحرائی جزیرہ نما دوبارہ ۱۹۷۹ء میں حکومت مصر کے دائرہ اختیار میں آیا، اس کے شمال میں خالص ریتیلا میدان ہے، درمیانی حصہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے بھرا ہوا ہے، جہاں جنگلی ہرنیں بکثرت ہیں، جنوبی حصہ بلند و بالا پہاڑی سلسلوں سے ڈھکا ہوا ہے، اسی سلسلہ کو کوہ طور کہا جاتا ہے، اس میں بلند چوٹیوں والا پہاڑ ہے، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام گئے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی تجلی ہوئی تھی، اس پہاڑ کو جبل موسیٰ کہا جاتا ہے، توریت اسی پہاڑ پر دی گئی تھی، اس کے دامن میں وہ مبارک درخت ہے جس کے پاس آگ دکھائی دی تھی اور جب حضرت موسیٰ اس کے قریب پہنچے تو اس کی اوٹ سے اللہ تعالیٰ کی آواز آئی تھی جس کا تذکرہ سورہ طہٰ میں موجود ہے، یہ پورا حصہ مختلف قسم کی معدنیات سے بھرا ہوا ہے، خاصی مقدار میں یہاں سے تیل بھی نکلنا شروع ہو گیا ہے، گیس کے ذخائر کا بھی پتہ چلا ہے۔

ابتدائے تاریخ سے اس علاقہ کا تعلق مصری مذہبی اعتقادات سے رہا ہے، آئی ایس (ISIS) گریگ گارڈ (GREEK GOD) نے جب مقتولہ سریس (OSIRIS) کے مثلہ کئے ہوئے جسم کو تلاش کیا تھا وہ جگہ یہیں تھی محبت اور غذا کی یونانی دیوی ہیتھر (HATHOR) کا تعلق بھی اسی علاقہ سے تھا، اور فراعنہ مصر اس کو وادی سینائی لیڈی کہتے تھے، یہیں وادی سینا میں واقع جبل موسیٰ پر صحائف عشرہ نازل ہوئے اور عیسائیوں کا خیال ہے کہ حضرت بی بی مریم اپنے چھوٹے بچے عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ HERAD ہیراڈ کے تنگ کرنے کی وجہ سے فرار ہوتے ہوئے اسی راستہ سے گزریں تھیں۔

سینٹ کیتھرائن سے معاہدہ:

ہجرت کے چھٹے برس رسالت مآب ﷺ سینٹ کیتھرائین متصل کوہ طور کے راہبوں اور تمام عیسائیوں کو ایک فرمان عطا فرمایا جو آزادی اور حقوق کی اپنی ایک مثال ہے، آپ ﷺ نے تحریر فرمایا، جو قلیل وکثیر اشیاء (منقولہ وغیر منقولہ) ان کے گرجاؤں کا ہنوں اور رہبانیت کی ان کے تحت ہیں اور جو اللہ اور رسول کے ہمسایہ ہیں وہ سب انہیں عیسائیوں کی رہیں گی، (یعنی باوجود اسلام نہ لانے کے ان سے کچھ نہ لیا جائے گا) نہ کسی پادری کو اس کے منصب سے بدلا جائے گا، نہ کسی راہب کو اس کی رہبانیت اور نہ کسی کاہن کا اس کی کہانت سے، نہ ان کے حقوق میں کوئی تغیر کیا جائے گا، اور نہ ان کی سلطنت میں یا اس چیز میں جس پر وہ تھے جب تک وہ خیر خواہی کریں گے، اور جو حقوق ان پر واجب ہیں ان کی اصلاح کریں گے، تو نا ان پر کسی ظلم کا بار پڑے گا اور نہ وہ خود ظلم کریں گے، حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے یہ معاہدہ قلم بند کیا۔

یہ معاہدہ لفظاً ومعناً حریت رواداری اور مساوات کا اتنا بڑا عظیم چارٹر ہے جس کی نظیر تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے، اس کی رو سے عیسائیوں کو ایسی مراعات حاصل ہوگئیں جو ان کو اپنے حکمرانوں کے عہد میں بھی حاصل نہ تھیں، اس معاہدہ نے عدم تعمیل کرنے والے مسلمانوں کو سخت سزا کا مستحق قرار دیا، ایسا مسلمان اللہ کے عہد کو توڑنے والا اس کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے والا اپنے دین کو ذلیل کرنے والا خیال کیا جائیگا، رسول کریم ﷺ نے خود عیسائیوں کی حفاظت کا ذمہ لیا اور یہی ذمہ داری اپنے پیروؤں پر ڈالی ان پر بے جا ٹیکس عائد نہیں کیے جائیں، کسی بشپ کو اس کی خانقاہ سے نہیں نکالا جائے، اسی معاہدہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ کسی بھی زائر کو زیارت کرنے سے روکا نہیں جائے گا، یہ معاہدہ رواداری کی ایک قابل فخر یادگار ہے، اس معاہدہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو منہدم کر کے وہاں مسجد تعمیر نہ کریں گے ایسی عیسائی عورتیں جو مسلمانوں کے نکاح میں آئیں وہ اس معاہدہ کی رو سے اپنے مذہب پر قائم رہ سکتی تھیں، مسلمانوں پر یہ بھی ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ عیسائیوں کو ان کے معابد کی مرمت میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔ (رسول اکرم کی سیاست خارجہ ص/راز پروفیسر محمد صدیق)

خانقاہ سینٹ کیتھرائن:

رومن پراسیکوٹرس سے بچنے کے لئے کرسچنس اسی وادی سینا کی طرف چلے گئے تھے اور چھٹی صدی عیسوی میں ماؤنٹ سینائی طور کے ڈھلوان پر مشہور جگہ 'شجرہ مبارکہ' کے پاس BURNING BUSH خانقاہ سینٹ کیتھرائن کی بنیاد ڈالی یہ جگہ ٹھیک جنوب سینائی کے وسط میں واقع ہے۔

سینٹ کیتھرائن نامی نوجوان دوشیزہ خاتون تھی، اس نے رہبانیت اختیار کر رکھی تھی، رومیوں کی طرف سے اسے شدید جسمانی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن وہ عیسائیت پر قائم رہی، بلکہ ان خواتین کا بھی (جن میں شہنشاہ میگزیمینس کی بیگم بھی شامل تھی) مذہب تبدیل کرادیا جو اس کو سمجھانے اور ترک رہبانیت پر آمادہ کرنے کے لئے بھیجی گئی تھیں (AD305-313) شہنشاہ نے غصہ میں آکر سینٹ کیتھرائن کو ایک تیز دھار پہیے میں باندھ کر چلوادیا لیکن اس کے باوجود وہ معجزاتی طور پر بچ گئی آخرکار AD307 میں شاہی فرمان کے بموجب اس کے سر کو قلم کردیا گیا۔

اس خانقاہ کی رہبانیت کا طریقہ کار گریگ آرتھوڈیکس پر ہے، اس بلڈنگ کی تعمیر دور وسطی کے چھوٹے پہاڑی قلعوں کی طرز پر ہے، یہاں ایک عالمی شہرت یافتہ لائبریری بھی ہے جس میں پرانے قلمی نسخے اور کتابیں ہیں، یونانی تہذیب پر قریب دو ہزار قلمی نسخے ہیں کئی سو لاطینی، عربی، فرنچ، اور انگریزی اور مختلف تہذیبوں سے متعلق امریکن فرنچ، انگلش، جولش، اور ایتھوپین کا پٹک کتابیں ہیں، بعض کتابیں تو بہت قدیم ہیں جن میں دنیا کی سب سے زیادہ مشہور کتاب 4th Century Codek Sierturs جو قدیم وجدید توریت وانجیل کے بعض حصوں اور Non Coumeal Works پر مشتمل ہے اس خانقاہ کے ساتھ ایک قدیم چرچ بھی ہے جہاں لائبریری، باورچی خانہ، ڈائننگ ہال، بشپ کے لئے گھر، پادریوں اور نس کے لئے مکانات ایک مہمان خانہ جس کے ۴۰ رلگ بھگ کمرے ہیں، جس کا ۴۰ رمصری پونڈ کرایہ ہے جس میں کھانے کی فیس بھی شامل ہوتی ہے۔

خانقاہ میں عوام کا داخلہ صبح نو تا بارہ بجے رہتا ہے (جمعہ اور اتوار کو چھٹی رہتی ہے) داخلہ فیس

کچھ نہیں، بلکہ عطیات وہدایا وغیرہ بھی قبول نہیں کیے جاتے، عوام صرف چرچ جو وادی مقدس پر بنا ہوا ہے اور شجرہ مبارکہ شجرہ موسیٰ اور فاطمی دور کی بنی ہوئی مسجد جو وادی مقدس کے بازو میں ہے دیکھ سکتے ہیں، اور بعض مخصوص حصے جو عام لوگوں کے لئے نہیں کھلے ہیں اس کے لئے خصوصی اجازت نامہ قاہرہ میں گریگ آرتھوڈیکس آفس الظہیر ۱۸ر سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔

سینٹ کیتھرائن کا شہر قاہرہ سے تقریباً چار سو کلومیٹر دوری پر جنوب مشرق میں واقع ہے، یہ جنوبی سینا کا اہم ضلع اور کمشنری بھی ہے، پورا شہر اونچی اونچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے، آبادی پوری مسلم ہے، کئی مسجدیں ہیں، جامع مسجد ابھی حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی، لیکن زلزلہ کے جھٹکے کی وجہ سے بعض حصوں میں شگاف پڑ گیا ہے، بازار پر رونق اور ہر طرح کی سہولتیں یہاں فراہم ہیں، کئی مشہور ہوٹل بھی ہیں جن میں سیاحوں کی بھیڑ رہتی ہے، لیکن اس وقت اقصر کے حادثہ کی وجہ سے جہاں بہت سے سیاحوں کو قتل کر دیا گیا تھا سیاحوں کی آمد متاثر ہوئی تھی، چنانچہ تقریباً سارے ہی ہوٹل خالی پڑے تھے، مصر کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ سیاحت بھی ہے، اس حادثہ کی وجہ سے حکومت بہت پریشان تھی، سیاحتی مراکز تک جانے کے لئے ہر طرح کا تحفظ اور کرایہ میں ۲۰ر کی کمی کے باوجود بھی سیاحوں کی آمد تقریباً موقوف ہو چکی تھی، جس وقت ہم لوگ بذریعہ بس سینٹ کیتھرائن پہنچے، شب کے نو بج رہے تھے، سردی شباب پر تھی، بس نے ایک چوراہے پر اتار دیا، بعض مقامی لوگوں نے فندق فیروز میں قیام کا مشورہ دیا، معلوم ہوا کہ سب سے سستا ہوٹل یہی تھا، مولوی عزیز ندوی کے ہمراہ پہاڑی کے ڈھلوان پر بنے اس ہوٹل کی طرف ہم چلتے رہے، پیر میں تکلیف کی وجہ سے چلنا دشوار ہو رہا تھا، لیکن شوق دید نے ہر قدم پر مہمیز کا کام کیا، بالآخر فندق فیروز کے صدر دروازہ پر ہم پہنچ گئے، پہاڑی کے دامن میں وسیع رقبہ پر منتشر چھوٹے چھوٹے کمرے نظر آئے، استقبالیہ خالی پڑا ہوا تھا، دور ایک کمرہ میں ہلکی سی روشنی نظر آ رہی تھی، تھکا ہارا مسافر رات کی تاریکی اور ٹھنڈی فضا میں اور کیا تمنا کر سکتا ہے، مولوی عزیز ندوی مجھے ڈھلوان پر چھوڑ کر تیزی سے اس کمرے کی طرف لپکے تاکہ کچھ رہنمائی مل سکے، تھوڑی دیر میں ایک نوجوان باہر آیا، اور اس نے ایک کمرہ کی طرف اشارہ کیا جو اندر سے بند ہو رہا تھا، معلوم ہوا

کہ کوئی سیاح اندر قیام پذیر ہے، دیر تک کنڈی کھٹکھٹانے کے بعد دروازہ کھلا، وہ برطانیہ کا سیاح تھا، ہمیں دیکھ کر پہلے وہ پریشان ہوا، لیکن جب اسے اطمینان دلایا گیا کہ ہم ہندوستانی ہیں اور سیاحت کی غرض سے یہاں آئے ہیں تو اسے تسلی ہوئی، لیکن خود اس کی ہیئت کذائی اور نہ جانے کتنے عرصے سے بدن پر پانی نہ بہانے کی وجہ سے ایک قسم کی بو کمرے میں پھیل رہی تھی، اس کی وجہ سے مناسب معلوم ہوا کہ اس کمرہ کو بدل دیا جائے، عزیزم مولوی عزیر نے یہ خدمت انجام دی، اور ٹھنڈی رات میں پھر وہ اس کمرے میں گئے اور دوسرے کمرے کی چابی لے کر واپس ہوئے، ہم لوگ فوراً اس کمرے میں منتقل ہو گئے، سیمنٹ شیڈ کا بنا ہوا کمرہ فرش کی جگہ دو اونچے چبوترے پر مشتمل تھا، کمرے کا دروازہ بیچ میں تھا، اور دونوں طرف چبوتروں پر چار چار بیڈ، گدے اور کمبل رکھے ہوئے تھے، معلوم ہوا کہ بیک وقت آٹھ سیاح ایک کمرے میں قیام کر سکتے تھے، باتھ روم کچھ فاصلہ پر اجتماعی تھا، پانی اس قدر سرد تھا کہ رگوں میں خون منجمد ہوتا، لیکن گرم پانی کی سہولت سے بڑی آسانی ہوئی۔

عشاء کی نماز اور کھانے سے فراغت تک رات کے گیارہ بج چکے تھے، کوہ طور پر جانے کے لئے شب میں تین بجے سفر شروع ہوتا ہے تاکہ صبح کوہ طور کے فرازوں سے طلوع آفتاب کا دلفریب منظر دیکھا جا سکے، عزیز ندوی اس پر مصر تھے کہ تین بجے اٹھ کر سحری کھائی جائے، اور پہاڑی چڑھنا شروع کر دیا جائے، رات کی تاریکی اور ٹھنڈک کے تصور نے میرے اندر ایک ہلچل پیدا کر رکھی تھی، اندر ایک اضطراب تھا، جس کو میں برادرم عزیز ندوی سے ظاہر نہ کر سکا، اس خیال سے کہ ان کا شوق متاثر ہوگا، وحشت آمیز تصور نے دیر تک مژگان کو اپنے گرفت میں رکھا اور نیند شرمسار دور کھڑی رہی، بڑی مشکل سے رہائی ہوئی تو نیند سے بغل گیر ہوئے سحری کے وقت بیدار ہوئے تو صبح کے چار بج رہے تھے، ہمراہ خورد و نوش کا جو کچھ سامان تھا وہ سرد ہو رہا تھا، بڑی مشکل سے کچھ کھایا گیا، اور اول وقت میں فجر کی نماز ادا کر کے کوہ طور کی طرف جانے کے بجائے ہم دونوں نے تھوڑی دیر مزید لیٹ جانے میں ہی عافیت محسوس کی، اور اب یہ طے ہوا کہ آٹھ بجے کوہ طور کی طرف چلیں گے اور دور سے دیکھ کر واپس آجائیں گے۔

کوہ طور کی طرف روانگی:

صبح آٹھ بجے ہم باہر نکلے ابھی تک گھاسوں پر شبنم کے قطرات ژالوں کی صورت میں نظر آرہے تھے، اور ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے من کی پرت گھاسوں پر جمع ہوگئی ہو، قرآن پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے کھانے کے لیے من وسلویٰ کوہ طور کے دامن میں فراہم کیا تھا، ایک عرصہ تک یہ کھانے کے بعد انھوں نے پیاز، سبزی اور دال کا مطالبہ کیا، جس پر ان کی سرزنش کی گئی اور یہ کہا گیا کہ کسی شہر میں جاؤ یہ چیزیں تمہیں وہاں مل سکتی ہیں، جب ہم اس کشادہ وادی میں پہنچے جہاں بنی اسرائیل کا قافلہ حضرت موسیٰ کی قیادت میں قیام پذیر ہوا تھا، اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے اہل خانہ کے ساتھ مصر کی طرف روانہ ہوئے تھے تو اس مقام پر شب گزاری کے لیے قیام ہوا تھا، وادی کے بائیں طرف کوہ طور کی طرف جاتے ہوئے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر حضرت ہارون علیہ السلام کی قبر بھی بتائی جاتی ہے جس کے آگے ایک چھوٹا سا چرچ بنا ہوا ہے، اور اس قبر کے محاذات میں اونچی پہاڑی کا سلسلہ وادی طوی تک گیا ہوا ہے، اس پہاڑی کے ایک حصہ میں زمین سے پانچ سات فٹ بلندی پر ایک بچھڑا بنا ہوا ہے، لیکن یہ مصنوعی نہیں ہے، بلکہ قدرتی طور پر پہاڑ میں ایسا کٹاؤ ہے کہ دیکھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ گائے کا بچھڑا کھڑا ہے میرے ساتھ ایک عرب بدو تھے ازراہِ تفنن کہنے لگے۔ أنظر إلى العجل السامری (سامری کا یہ بچھڑا دیکھئے)

وادی طوی:

وادیٔ طوی دیکھنے کی خواہش تھی، لیکن وہ دن اتوار کا تھا اور بندی تھی، افسوس ہوا لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جس وقت ہم لوگ اس کے مین گیٹ پر پہنچے اس وقت ایک پادری کا باہر آنا ہوا۔ ان سے ملاقات ہوئی، اور جب اسے معلوم ہوا کہ ہم لوگ ہندوستان سے آئے ہیں تو بہت خوش ہوا، اور مرحبا کہا اور اندر جانے کی اجازت دے دی، اس سنگی عمارت کے بیچ میں صحن ہے، اس صحن میں وادی طوی کا حصہ ہے جس پر کسی عیسائی بادشاہ نے چرچ بنادیا ہے، اور اس کے داہنی طرف اسی مذکورہ صحن میں فاطمی دور کی مسجد بھی ہے جو بند پڑی ہوئی ہے، وادی طوی کے مشرقی کنارہ پر وہ

شجرۂ مبارکہ ہے، جس میں موسیٰ علیہ السلام کو تجلی نظر آئی تھی۔ اور آگ سمجھ کر وہ آگ لینے وہاں آئے تھے۔

اس مبارک درخت کو قریب سے دیکھا، دنیا کا وہ واحد درخت ہے، اس طرح کا درخت کہیں اور نہیں دیکھا گیا، اس کے چھوٹے چھوٹے پھول اور پتیاں بھی چھوٹی ہوتی ہیں، اس پر ہاتھ لگانے سے منع کیا گیا ہے، لیکن دل کی بے تابیوں نے دست دراز کر دیا اور دو پتیاں میں نے اپنی جھولی میں ڈال ہی لی، بہت دنوں تک وہ پتیاں ہمارے پاس رہیں پھر معلوم نہیں کہاں کھو گئیں۔

شجرۂ مبارکہ کی زیارت سے فارغ ہو کر وادی طوی سے گزرتے ہوئے چاہ موسیٰ پر جانا ہوا، ابھی تک اس کنویں میں قابل استعمال پانی ہے، بالٹی اور ڈول بھی گھڑاری پر موجود ہے، بتایا گیا کہ اس کنویں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی نوش کیا تھا، پانی شیریں اور صاف ہے، یہ بھی ایک معجزہ سے کم نہیں کہ اب تک اس کنویں میں پانی موجود ہے، چاہِ موسیٰ سے آگے بڑھے تو سنگی فصیل سے ملحق کمرے اور دالان اور رہائش گاہیں، اور پادری حضرات کی خوابگاہیں، نیز ڈرائنگ روم اور دار المطالعہ کتب خانہ وغیرہ موجود ہے۔

کوہ طور:

صبح آٹھ بجے ہم کوہ طور کے قصد سے روانہ ہوئے، سینٹ کتھرائن خانقاہ سے تقریباً پانچ کیلو میٹر کے فاصلے پر کوہ طور واقع ہے، کچی راہ داری سے گذرتے ہوئے کوہ طور کے دامن میں بھی پہنچنے کے بعد کوہ طور پر چڑھائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ چڑھنے کی سہولت کے لیے زینے بنا دئے گئے ہیں۔ پہاڑیوں کا خاصہ حصہ ہم لوگوں نے کچی راہ داریوں سے طے کر لیا تھا، اب بالکل سیدھی چڑھائی تھی، چڑھنے والوں نے سہولت کی خاطر پتھروں کے اسٹیپ تراشے ہیں، جس سے چڑھنے میں آسانی ہوتی ہے، لیکن چوں کہ سیدھی چڑھائی اور کوہ طور کی بلندی جبل ثور سے بھی زیادہ ہے، لہٰذا ہر شخص کے لیے آسان نہیں، مجھے بھی بڑی دشواری ہوئی، رمضان کا مہینہ تھا اور آخری عشرہ میں ہر چند کی مسافر تھا مگر روزے سے تھا۔ لیکن پیاس کی شدت روزے پر قائم نہ رہنے دیا، اور روزہ نہ رکھنے میں ہی عافیت محسوس کی، میرے رفیق سفر مولوی عزیز ندوی کی بڑی

عزیمت کے حامل تھے، انھوں نے روزہ قائم رکھا، جب کہ چوٹی تک پہنچنے میں پانچ گھنٹے لگے، اوراس طرح تین گھنٹے واپسی میں صرف ہوئے۔

کوہ طور کی چوٹی:

کوہ طور کی دو چوٹیاں ہیں، ایک بلند چوٹی پر قسطنطین اعظم کا بنایا ہوا چرچ موجود ہے، اور دوسری چوٹی جو اس سے کم اونچی ہے، اس پر فاطمی دور کی مسجد بنی ہوئی ہے۔

پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے کے بعد ایک خاص تاثر ہوا، خیالات کی دنیا میں کھو گیا، قرآن کی صفحات سامنے آگئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اس چوٹی پر چالیس دن گزارنے کا واقعہ نظروں میں گھوم گیا کہ اس بلندی پر کس طرح ایک دو دن نہیں چالیس دن آپ نے گزارے ہوں گے، دوسری چوٹی پر مسجد کے شمالی حصہ میں ایک بسیط غار ہے، کہتے ہیں اس غار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام آرام فرماتے تھے، اس میں اتنی وسعت ہے کہ ایک آدمی آرام سے لیٹ سکتا ہے، اس غار میں اتر کر لیٹنے کی سعادت بھی حاصل کی گئی۔

مسجد کی چہار دیواری:

کوہ طور کی دوسری چوٹی پر بنی ہوئی مسجد کی مشرقی چہار دیواری میں اس پہاڑ کی طرف جو اس کے محاذات میں ہے جس پر اللہ رب العزت کی تجلی ہوئی تھی، اور اس کا بلند حصہ پگھل کر نیچے کی طرف بہہ گیا تھا، کوہ طور کے چاروں طرف کئی پہاڑ ہیں سب کی چوٹیاں ہیں، صرف اسی ایک پہاڑ کی چوٹی نہیں ہے، اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہی پہاڑ ہے جس پر تجلی ہوئی " فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا " جب آپ کے رب نے اس پہاڑ پر تجلی ڈالی تو اس کی چوٹی کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ (الاعراف)

اس کی چہار دیواری پر بیٹھ کر اسی آیت کی تلاوت کرتے ہوئے اور خیالات کی دنیا میں مشاہدات کی لذت پاتے رہے، چہار دیواری پر بیٹھا تلاوت قرآن میں مصروف تھا کہ اسی اثناء میں تسبیح وتحلیل کی آواز گونجی، دیکھا کہ سرو قد عرب ہماری طرف آرہے ہیں، انھوں نے اکر وطن دریافت کیا اور یہ معلوم کر کے خوش ہوئے کہ ہم لوگوں کا تعلق ہندوستان سے ہے، اور انھوں نے

میری داڑھی کو بوسہ دیا اور واپس ہو گئے ہم لوگوں کی واپسی بھی اس کے بعد ہی ہوئی لیکن پہاڑی سے اترتے ہوئے کہیں نظر نہیں آئے۔

واپسی میں تین گھنٹے صرف ہوئے، سینٹ کتھرائن پہنچ کر کھانا تناول کیا گیا اور پھر واپسی کی فکر کی گئی، دوسرے دن ہم لوگ قاہرہ میں تھے، مدینۃ البعوث میں محاضرات جاری تھے، ہماری غیر حاضری نوٹ کی گئی، اور سرزنش بھی ہوئی، لیکن ہمیں خوشی تھی کہ ایک محبط وحی کوہ طور دیکھ آئے، اور اس کی زیارت سے شاد کام ہوئے۔ ایک ہفتہ کے بعد واپسی تھی، جامعۃ الازہر نے ہدیۃً بہت سی کتابیں دیں اور اس پر جو خرچ آتا تھا اس کا بھی نظم کیا بڑی فراخ دلی اور سیر چشمی کا معاملہ کیا اور یہ تین مہینے لمحوں میں گذر گئے اور عید سے پہلے جنوری ۱۹۹۹ء میں لکھنؤ واپسی ہو گئی، اس طرح یہ سفر تمام ہوا، جو معلوماتی بھی تھا اور برکت والا بھی۔

فتح مصر

فاتح مصر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ میں امارت وقیادت کی خداداد صلاحیتیں تھیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ملک شام کی امارت کی ذمہ داری انھیں تفویض فرمائی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انھیں پہلے فلسطین کا گورنر بنایا، پھر مصر کی جانب امیر لشکر بنا کر بھیجا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فتح ونصرت سے نوازا اور آپ فاتح مصر کے لقب سے مشہور ہوئے۔

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ کے دور خلافت میں چار سال تک مصر کے سربراہ رہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین فیصلے میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے آپ حکم مقرر ہوئے۔

فاتح مصر کو مقوقس بادشاہ کا پیغام

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فاتح مصر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ جب مصر کے قلعہ کا محاصرہ کیا تو قبطی بادشاہ مقوقس نے جزیرہ مصر میں پناہ لی اور اس تک پہنچنے کے لیے دریائے نیل پر جو پل بنا ہوا تھا وہ توڑ دیا تا کہ مسلمان وہاں تک نہ پہنچ سکیں۔ ساتھ ہی اس نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس اپنے ایلچیوں کے ذریعہ یہ پیغام بھیجا کہ تم ایک طرف دریائے نیل اور دوسری طرف رومی فوج کے درمیان گھر گئے ہو، تمہاری تعداد بھی کم ہے اور اس وقت تم قیدیوں کی طرح ہو اس لیے بہتر ہے کہ تم صلح کی بات کرنے کے لیے اپنے کچھ آدمی میرے پاس بھیج دو۔

جب یہ ایلچی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے ان کو فوراً کوئی جواب نہ دیا اور ان کو دو دن و دو رات اپنے پاس مہمان رکھا، مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو قریب سے دیکھ لیں۔ پھر مقوقس کے پاس لوٹے تو اس نے ان سے مسلمانوں کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ ''ہم نے ایک ایسی قوم دیکھی ہے جس کا ہر ایک فرد زندگی سے زیادہ موت کو پسند کرتا ہے۔ وہ تواضع اور خاکساری کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ان میں کسی کے دل میں حرص ولالچ نہیں ہے۔ وہ زمین پر بیٹھتے ہیں اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ ان کا امیر ایک عام شخص کی طرح ہے۔ ان میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آقا کون ہے اور غلام کون؟ جب نماز کا وقت آتا ہے تو ان میں سے کوئی پیچھے نہیں رہتا۔ وہ اپنے اعضاء پانی سے دھوتے ہیں اور بڑی عاجزی سے نماز پڑھتے ہیں۔''

یہ سن کر مقوقس بول اٹھا ''ان لوگوں کے سامنے پہاڑ بھی آجائیں تو ٹک نہیں سکتے۔ ان سے کوئی لڑ نہیں سکتا۔''

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی ولولہ انگیز تقریر

شاہ مقوقس کی خواہش پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مقوقس کے پاس دس آدمیوں کا ایک وفد بھیجا۔ جس کے رئیس حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا رنگ کالا تھا۔ مقوقس نے ان کو دیکھا تو سہم گیا اور کہنے لگا ''مسلمان ایسے ہی ہوتے ہیں؟ کیا یہ جنگ کریں گے؟''

مقوقس کی باتیں سن کر حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے یوں تقریر شروع کی کہ ''میں نے تمہاری باتیں سنیں، اب ان کا جواب سنو۔ جن آدمیوں کے پاس سے میں آیا ہوں ان میں ایک ہزار کالے آدمی اور بھی موجود ہیں۔ جن کا رنگ مجھ سے بھی کالا ہے اور صورت مجھ سے زیادہ مہیب اور جلالی۔ اگر تم ان کو دیکھو تو تمہارا کیا حال ہو؟ سنو! میں اگرچہ بوڑھا ہوں اور میرا شباب رخصت ہو چکا ہے لیکن الحمدللہ! کہ میں سو آدمیوں سے تنہا بھی نہیں ڈرتا، یہی حال میرے اور ساتھیوں کا ہے اور اس کا باعث یہ ہے کہ ہمارا اصلی مقصود خدا کی راہ میں جہاد کرنا ہے

اور اس کی رضا جوئی ہے۔ ہم ملک گیری یا کسی دنیوی لالچ کے لیے جنگ نہیں کرتے۔ خدا نے ہمارے لیے مالِ غنیمت حلال کیا ہے۔ ہمیں دنیوی تمول کی کوئی پرواہ نہیں۔ ہمارے پاس لاکھوں درہم ہوں یا صرف ایک، دونوں حالتیں ہمارے لیے برابر ہیں۔ ہمارے لیے دنیوی نعمتیں کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ ہماری اصلی نعمت اخروی راحت ہے۔ ہمارے برگزیدہ رسول ﷺ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم مال دنیا سے صرف اسی قدر لیں گے جس سے بھوک رک سکے اور ستر چھپ سکے۔''

مقوقس نے یہ تقریر سنی تو کہا ''جو کچھ تم نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے متعلق کہا، میں نے سن لیا۔ بے شک تم اپنی خوبیوں کے باعث ہم لوگوں پر غالب آ کر رہو گے اور دنیا کی کوئی طاقت تمہارا مقابلہ نہ کر سکے گی۔ لیکن اس وقت تمہارا مقابلہ مجھ سے ہے اور یاد رکھو، مجھ سے تم ہرگز مقابلہ نہ کر سکو گے کہ میں نے اس قدر فوج جمع کر لی ہے کہ تمہارا فتح یاب ہونا مشکل ہے۔ پس تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ میں تم میں سے ہر ایک شخص کو دو دو دینار اور تمہارے خلیفہ کو ایک ہزار دینار دیتا ہوں۔ تم یہ رقم لو اور واپس چلے جاؤ۔''

حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ اس کی یہ باتیں سنتے رہے اور فرمایا کہ ''تم اور تمہارے ساتھی دھوکہ میں نہ رہیں۔ تم ہمیں رومیوں کے ٹڈی دل لشکر سے ڈراتے ہو۔ مجھے قسم ہے خدا کی! کہ ہمیں اس کی رتی بھر پروا نہیں۔ بلکہ تمہاری اس گفتگو نے ہمارے جذبۂ جہاد کو اور بھی ابھار دیا ہے۔ اب ہم ان دو برکتوں میں سے ایک برکت ضرور حاصل کر کے رہیں گے۔ ہم فتح یاب ہوئے تو مالِ غنیمت کثرت کے ساتھ ہاتھ آئے گا اور اگر تم غالب ہو گئے تو ہم شہید ہوں گے اور ہمارے ہاتھ دولت آخرت آئے گی۔ ہم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جو صبح و شام خدا سے شہادت کی دعا نہ مانگتا ہو۔'' آخر جنگ شروع ہوئی اور وہی کچھ ہوا جو کچھ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا۔ یعنی خدا کی چنی ہوئی قوم مصر پر قابض ہو گئی اور مجاہدین نے جو کچھ کہا، وہ کر کے دکھایا۔ (تاریخ اسلام، ص:۵۳)

امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مصر کی فتح پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ

عنہ کو مقرر فرمایا تھا۔ انھوں نے تھوڑے ہی عرصے میں باب الیون بلبیس، فسطاط وغیرہ کئی مصری شہروں کو فتح کرلیا۔ پھر اسکندریہ کی طرف بڑھے۔ مصریوں نے قلعہ بند ہوکر زبردست مقابلہ کیا۔ اس سے مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ جب کئی ماہ تک اسکندریہ فتح ہونے میں نہ آیا تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دارالخلافہ سے مدد مانگی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چار ہزار سوار بطور کمک روانہ کیے جو چار افسران کی ماتحتی میں تھے۔ یہ افسر حضرت زبیر بن العوام، حضرت مقداد بن اسود کندی، حضرت مسلمہ بن مخلد اور حضرت عبادہ بن صامت رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے جو فن سپہ گری میں تمام عرب میں منتخب تھے۔

یہ کمک روانہ کرتے وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے مردم شناس نابغہ روزگار نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ان افسروں میں ہر شخص ایک ہزار آدمیوں کے برابر ہے۔ اس بنا پر یہ فوج چار ہزار نہیں بلکہ چالیس ہزار ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت بھی کی کہ جس وقت میرا یہ خط تم کو ملے لوگوں کو جمع کرکے ان کے سامنے جہاد کے فضائل بیان کرو، اور جن چار افسروں کو میں نے بھیجا ہے ان کو فوج کے آگے کرکے جمعہ کے دن حملہ کرو۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس یہ کمک پہنچی تو انھوں نے فوج کے سامنے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا خط پڑھا اسے سن کر مجاہدین میں زبردست جوش پیدا ہوگیا۔ جمعہ کے دن حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فوج مرتب کرکے اسکندریہ پر بھرپور حملہ کا ارادہ کیا۔ انھوں نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ان کا نیزہ لیا اور اس پر اپنا عمامہ لٹکا کر ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ پرچم لیجیے اور اس فوج کی قیادت کیجیے آپ ہی امیر لشکر ہیں۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے نہایت جوش سے ایسا زبردست حملہ کیا کہ رومیوں کے دفاعی استحکامات درہم برہم ہوگئے اور ان کی ہمتیں پست ہوگئیں۔ بحری و بری راستے سے جدھر راہ ملی بھاگ نکلے اور مسلمان فاتحانہ شان سے اسکندریہ میں داخل ہوگئے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے جس زمانہ میں یہ کارنامہ سرانجام دیا وہ تقریباً ساٹھ برس کے تھے، اس عمر میں اس

بے جگری سے میدان رزم میں اترنا کسی ایسے شخص ہی کا کام ہوسکتا ہے جو غیر معمولی عزم وہمت کا مالک ہو اور شجاعت اور بسالت میں بھی اپنا جواب آپ ہو۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور کبوتری کے انڈے

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں کہ ''جس جگہ آج قاہرہ آباد ہے وہاں کوئی بڑا شہر موجود نہ تھا بلکہ ایک فوجی قلعہ تھا جو حملہ آوروں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء نے مصر کے چند ابتدائی علاقے فتح کرنے کے بعد اس قلعہ کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ چھ مہینے جاری رہا۔ اس قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ایک بڑا خیمہ قلعے کے سامنے نصب فرمایا تھا۔ پیش قدمی کا ارادہ فرمایا تو اس خیمے کو اکھاڑ کر ساتھ لے جانا چاہا، لیکن جب اکھاڑنے کے لیے آگے بڑھے تو دیکھا کہ خیمے کے اوپر کی جانب ایک کبوتری نے انڈے دے رکھے ہیں اور کبوتری ان پر بیٹھی ہے، خیمہ اکھاڑنے سے یہ انڈے ضائع ہوجاتے ہیں۔ اس لیے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کبوتری نے ہمارے خیمے میں پناہ لی ہے اس لیے اس خیمے کو اس وقت تک باقی رکھو جب تک یہ بچے پیدا ہوکر اڑنے کے قابل نہ ہوجائیں چنانچہ خیمہ باقی رکھا گیا۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے خیمہ مصر کے علاقہ فسطاط میں لگایا تھا اور اس کی دلیل کے طور پر وہ لکھتے ہیں کہ عربی میں خیمہ کو فسطاط کہتے ہیں۔ آپ نے واپسی پر اس جگہ ایک شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا جس کا نام کبوتر کے اس خیمہ کی نسبت سے فسطاط مشہور ہوگیا۔ یہ شہر آج مسلمانوں کے حسن اخلاق کی گواہی دے رہا ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور مصر کی فتوحات

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قیساریہ سے روانہ ہوئے اور چار ہزار فوج کے ساتھ مصر میں داخل ہوگئے۔ وہ شمالی سیناء سے گزرتے ہوئے آگے بڑھے۔ عیسائیوں سے اوّلین معرکے قلعہ فرما اور بلبیس میں پیش آئے۔ اس دوران عمرو رضی اللہ عنہ کے لیے کمک آپہنچی اور ان کا لشکر بارہ ہزار ہوگیا۔

عین الشمس (ہیلیو پولس) میں ایک بڑی جنگ ہوئی جس میں رومیوں نے شکست فاش کھائی۔ پھر قلعہ بابلیون اور الفیوم یکے بعد دیگرے فتح ہوگئے۔ اس کے بعد حضرت عمرو رضی اللہ عنہ مصر کے دارالحکومت اسکندریہ کی طرف بڑھے اور ذی قعدہ ۲۱ ہجری مطابق ستمبر ۶۴۲ء میں شدید لڑائی کے بعد اسکندریہ کے رومیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس طرح ڈیلٹا (نیل) کے شہر ایک ایک کر کے مسلمانوں کے تسلط میں آ گئے۔ پھر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے مغرب کا رُخ کیا۔

حضرت عمرو بن العاص قیساریہ سے روانہ ہوئے اور ''عریش سے فرما'' تک کا علاقہ عبور کر کے وہاں کا قلعہ فتح کیا۔ پھر بلبیس، ام دنین، عین الشمس، الفیوم اور آس پاس کے دیہی علاقے اور آخر میں توج فتح کر لیا۔ آخر کار رمضان ۲۱ ہجری مطابق اگست ۶۴۲ء میں اسکندریہ کی فتح کے ساتھ فتوحات مصر کی تکمیل ہوگئی۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مصر کے پہلے امیر ہوئے اور انھوں نے براعظم افریقہ میں پہلی مسجد تعمیر کی جواب تک ان کے نام سے منسوب ہے اور معروف ہے۔ پھر اس مسجد کے گرد شہر فسطاط آباد کیا تا کہ مصر کا اسلامی دارالحکومت بنے۔ انھوں نے مصر کے قبطیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور ان کے دینی و عمائی معاملات میں رومیوں نے ان پر جو ظلم روا رکھا تھا، اس کا قلع قمع کیا۔ وہاں کے بطریق قبطیوں کے لیے معافی کا اعلان کیا۔ بنا بریں ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا عہد حکومت مصری قبطیوں کے لیے ان سے پہلے بلکہ بعد میں آنے والے فرماں رواؤں کے مقابلے میں بھی ایک سنہری دور تھا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو مصر کی حکمرانی سے معزول کر دیا۔ لیکن مینوئل ''خصی'' کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے انھیں دوبارہ والی بنا دیا گیا۔

تیسری بار فتح مصر کا واقعہ

قیصر قسطنطین نے ایک تجربہ کار سپہ سالار کو ایک زبردست فوج دے کر کشتیوں کے ذریعے اسکندریہ کی جانب روانہ کیا۔ اسکندریہ کے رومی (یونانی) اس سے مل گئے اور معمولی جھڑپ کے بعد شہر رومی فوج کے قبضے میں آ گیا۔ یہ سن کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص

رضی اللہ عنہ کو دوبارہ گورنر مصر مامور کیا اور انھوں نے اسکندریہ تیسری مرتبہ فتح کیا۔ اس سے پہلے انھوں نے تمام شہر کو ویران و مسمار کرنے کی قسم کھائی تھی مگر فتح کے بعد انھوں نے لشکر کو قتل و غارت سے روک دیا اور جس جگہ قسم کھائی تھی وہاں مسجد رحمت تعمیر کرادی۔ (تاریخ اسلام، اکبر شاہ نجیب آباد، ۱/۴۳۰)

مصر کی طرف اسلامی لشکر کی پیش قدمی کا حیرت انگیز واقعہ

یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ مطابق ۱۲۲۹ء) نے مصر میں غازیان اسلام کے داخلے کے سلسلے میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ''تم لشکر لے کر جاؤ اور میں تمہاری اس پیش قدمی کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ میرا خط تمہارے پاس پہنچے گا۔ جب میرا خط تمہارے پاس پہنچے، اگر اس وقت تم دیکھو کہ سرزمین مصر میں داخل نہیں ہوئے ہو یا تھوڑی دور اس سے رہ گئے ہو تو میرا حکم یہ ہے کہ تم وہیں سے لوٹ آنا۔ لیکن میرا خط پہنچنے سے پہلے تم دیکھو کہ مصر میں داخل ہو چکے ہو تو اللہ کا نام لے کر اور اس کی مدد طلب کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جانا۔''

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر لے کر چلے۔ ادھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا اور انھیں ان مجاہدین کی سلامتی کے بارے میں کچھ خدشہ لاحق ہوا تو انھوں نے عمرو رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ واپس چلے آؤ۔ پھر جب وہ عمرو رضی اللہ عنہ کو ملا، اس وقت وہ رفح (فلسطین کی آخری بستی) میں تھے تو انھوں نے قاصد سے وہ خط وصول کرنے میں احتراز کیا اور باتوں باتوں میں اسے آگے لے چلے۔ حتی کہ وہ عریش پہنچ گئے۔ وہاں انھیں بتایا گیا کہ اب وہ مصر میں ہیں۔ تب انھوں نے قاصد سے خط لیا اور پڑھ کر مسلمانوں کو سنایا۔

پھر اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ ''تم جانتے ہو یہ مصر کی بستی ہے۔'' انھوں نے کہا ''ہاں!''

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بولے ''امیر المومنین نے مجھ سے عہد لیا تھا کہ ان کا

مجھے ملے گا اور اگر میں اس وقت تک مصر میں داخل نہ ہوا تو لوٹ چلوں گا لیکن میں تو مصر میں داخل ہو چکا ہوں، لہٰذا اللہ کی حمایت سے آگے بڑھتے چلو۔'' (معجم البلدان، ۴/۲۶۲)

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مسجد عمرو بن عاصؓ کی تعمیر

جناب یعقوب نظامی صاحب اپنے سفرنامہ شام میں لکھتے ہیں کہ اہرام سے فارغ ہو کر ہم وسط شہر میں ''جامع مسجد عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ'' پہنچے جو نہ صرف مصر بلکہ پورے افریقہ کی قدیم ترین مسجد ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر فتح کیا تو یہاں سب سے پہلے ایک بڑی مسجد کی بنیاد ڈالنی چاہی۔ اس وقت یہاں انگور وغیرہ کے باغات تھے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے حکم پر زمین ہموار کی گئی۔ مسجد کا قبلہ متعین کرنے میں اسّی (۸۰) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ جن میں حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے اسماء گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مسجد کے سب سے پہلے امام خود حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ تھے اور مؤذن ایک دوسرے صحابی حضرت ابومسلم یافعی رضی اللہ عنہ تھے۔

بعد میں حضرت مسلمہ بن مخلد انصاری رضی اللہ عنہ نے (جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مصر کے حاکم تھے) اس مسجد میں توسیع کی اور اس میں مینار بنایا اور کہا جاتا ہے کہ مصر میں مسجد کے ساتھ مینار تعمیر کا آغاز انھوں نے ہی کیا۔ پھر ۷۷ھ ہجری میں عبدالعزیز بن مروان نے یہ مسجد از سر نو تعمیر کی اور اس کے بعد ولید بن عبدالملک کے حکم سے اسے منہدم کر کے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اس وقت اس پر نقش ونگار کا اضافہ ہوا اور اس کے ستونوں پر سونے کا پانی چڑھایا گیا۔

(حسن المحاضرۃ للسیوطی رحمۃ اللہ علیہ، ص:۳۷، ج:۱)

اس مسجد میں بڑے جلیل القدر بزرگانِ دین، علماء کرام اور اولیاء واتقیاء نمازیں پڑھتے رہے ہیں۔ ابتدائے اسلام میں یہی مسجد مجلس قضاء کا کام بھی دیتی تھی اور بعد میں یہاں بڑے

عظیم الشان حلقہ ہائے درس بھی قائم ہوئے۔

علامہ ابن صائغ حنفی کا کہنا ہے کہ میں نے ۷۴۹ھ سے پہلے اس مسجد میں چالیس سے زائد علمی حلقے شمار کیے ہیں۔ نیز کہا جاتا ہے کہ رات کے وقت یہاں اٹھارہ ہزار چراغ روشن ہوتے تھے اور روزانہ گیارہ قنطار تیل خرچ ہوتا تھا۔

(حسن المحاضرۃ للسیوطی رحمۃ اللہ علیہ، ص:۱۵۲، ج:۲)

اس مسجد کی پوری تاریخ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن المحاضرۃ میں بیان فرمائی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین اسلام اور علماء وفضلاء کو اس مسجد کے ساتھ کتنا شغف رہا ہے۔

یہ مسجد پچھلے دنوں بہت بوسیدہ ہوگئی تھی، اب اس کی از سر نو تعمیر کی گئی ہے اور اس میں بہت توسیع ہوئی ہے۔ آج بھی یہ قاہرہ کی ممتاز ترین مسجد ہے۔